فہرست

زبان

بڑھے ایک نقطہ تو ہوئے زیاں

زبان کیا ہے؟ عضلے کا ایک چھوٹا سا حصہ۔ لیکن ساخت کے لحاظ سے نہایت حیرت انگیز کیونکہ زبان ہی کی مدد سے دنیا بھر کے سیکڑوں ملکوں میں رہنے والے انسان سیکڑوں زبانوں میں بات چیت کرتے ہیں جب کہ ہر زبان کی ادائیگی، لب ولہجہ، تلفظ اور آواز دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ زبان ہی کی وجہ سے چٹخارہ ہے کیونکہ زبان ہی ترش، شیریں، گرم وسرد اور تلخ ونمکین میں اس طرح تمیز کرتی ہے کہ انسان دنیا کے خواہ کسی حصے میں رہتا ہو اس کی مدد سے وہ کھانے کا لطف اٹھاتا ہے بلکہ سچ پوچھیے تو اس کے بغیر ہم کھا نہیں سکتے۔

جی ہاں! اس تحیر خیز اور ہر سمت حرکت کرنے اور بیک وقت مختلف کام انجام دینے والے عضو کی ساخت کچھ اس انداز کی ہے کہ کسی تکلیف کے بغیر ہم غذا کو منہ میں ہر طرف گھما سکتے ہیں اور بعد ازاں چبائی ہوئی غذا کو پیچھے دھکیل کر حلق کے پاس پہنچا سکتے ہیں تاکہ اسے نگلا جا سکے۔

اگر آپ نے اپنی غذا کا لطف اٹھایا اور اگر کھانے کی خوشبو کی لپیٹیں آپ کی جان کو معطر کریں جس سے آپ کے منہ میں پانی بھر آئے تو پھر یہ لطف پیدا کرنے میں بھی زبان کا بڑا حصہ ہے۔ زبان اس کھانے کو لعاب دہن کی آمیزش سے ذائقہ دار بنا

دیتی ہے جس کے سبب بعدازاں ہم معدے کی تکلیف سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

زبان کو قدرت نے حسِ ذائقہ سے بھی نوازا ہے جس کے سبب ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ جو غذا ہم کھار ہے ہیں وہ اچھی ہے یا خراب۔

یہی وجہ ہے کہ باورچی کھانا پکانے کے دوران ذائقہ چکھ کر دیکھ لیتا ہے کہ نمک مرچ مصالحہ ٹھیک ہے یا اس میں کمی بیشی کی ضرورت ہے۔

بظاہر تو انسان کو زبان ایک سادہ سا گوشت کا لوتھڑا دکھائی دیتی ہے۔ تاہم اگر اس کا بنظرِ غائر مطالعہ و مشاہدہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک پیچیدہ عضو ہے جس کی ساخت میں بڑی ذہانت سے کام لیا گیا ہے۔ اس میں ایسے رگ پٹھے ہیں جو مختلف سمتوں کو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم زبان کو جدھر چاہیں گھما سکتے ہیں۔ کبھی باہر آتی ہے تو کبھی اندر جاتی ہے اور پھر نوکِ زبان سے ہم ہر چیز کو محسوس کر لیتے ہیں۔ نوکِ زبان کی مدد سے ہم چاول کا ایک دانہ، گوشت کا ذرا سا ریشہ یا کرِک تک کا پتہ چلا لیتے ہیں۔

زبان پر ایک غلاف یا جھلی سی پائی جاتی ہے۔ جو غشائے مخاطی کہلاتی ہے اس کے علاوہ اس کی سطح پر چار قسم کے چھوٹے آگے کو نکلے ہوئے حصے ہوتے ہیں جو بھٹنی کہلاتے ہیں۔ مثلاً ایک قسم ننھے تکون نما ابھاروں کی سی ہے جو زبان کی پوری سطح کے ساتھ ساتھ حاشیوں اور نوکِ زبان تک محیط ہیں۔ یہ ابھار بلی کے خاندان کے جانوروں میں زبان کو ایسا سوہن یا ریتی نما بنا دیتے ہیں کہ وہ اس کی مدد سے گوشت کو بڑی صفائی کے ساتھ ہڈی سے جدا کر دیتی ہیں۔

دوسرے ابھار معمولی پن کے سرے کے برابر ہوتے ہیں یہ سانپ کی چھتری کی شکل کے ہوتے ہیں۔ یہ ابھار عام طور پر زبان کے سرے اور دونوں جانب ہوتے ہیں۔ ان کا رنگ گلابی ہوتا ہے اور اس میں ذائقہ کی حس پائی جاتی ہے۔

ابھار کی ایک اور قسم تعداد میں سات سے لے کر دس تک ہوتی ہے۔ یہ ابھار زبان کی پشت پر ہوتا ہے اور ننگی آنکھ سے دکھائی دیتے ہیں۔ سائنس دان چوتھی قسم کے ابھاروں کا بھی ذکر کرتے ہیں جو زبان کی دونوں جانب غشائے مخاطی کے چنٹوں میں

اور زبان کی پشت پر پائے جاتے ہیں۔

اس لحاظ سے زبان کو محض ایک سادہ سا عضلہ یا گوشت کا ایک ٹکڑا نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس کی ساخت میں جو بے حد پیچیدہ ہے قدرت نے اپنی صناعی کا بہترین مظاہرہ کیا ہے۔ ذائقہ اور حرارت کی حس کے ماسوا زبان جسم کے کسی اور حصے سے کہیں زیادہ حساس ہوتی ہے۔

جانوروں کی دنیا میں زبان کی مختلف اقسام ہمیں ملتی ہیں۔ مثلاً سانپ کی دو شاخی زبان پر غور کیجئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سانپ اپنی پتلی سی لہراتی اور بل کھاتی ہوئی زبان سے کاٹتا ہے اور پھر اپنے شکار کے زخم میں زہر داخل کرتا ہے۔ مگر حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ اس مقصد کے لیے وہ اپنے دانت استعمال کرتا ہے۔ سانپ کی زبان چمٹے کی طرح دو شاخی ہونے کے علاوہ پتلی اور بے حد حساس ہوتی ہے۔ سانپ ہوا کو محسوس کرنے کے لیے تھوڑے وقفے سے اپنی زبان باہر کی طرف نکالتا ہے۔ پھر جب وہ اس زبان کی نوک سے اپنے تالو کے حس والی خلاؤں کو چھوتا ہے۔ تو ہوا کی بو والے سالمے جو اس کی زبان کی نوک سے چپک جاتے ہیں اس میں بو کی حس پیدا کرتے ہیں گویا سانپ اپنی زبان سے سونگھنے کا کام لیتا ہے۔ سانپ کے منہ میں ایک خلاف سا ہوتا ہے۔ جس کے اندر وہ اپنی زبان کو محفوظ کر لیتا ہے تا کہ جب یہ زیادہ استعمال میں نہ آئے تو اسے نقصان نہ پہنچ جائے۔

گرگٹ کی زبان اس کے جسم کے تناسب سے بے حد طویل ہوتی ہے جب گرگٹ اپنے اس شکار کو دیکھتا ہے جو اس کی خوراک کا کام دے سکتا ہے تو نہایت صبر کے ساتھ وہ ہولے ہولے اس کے قریب پہنچتا ہے۔ اور پھر بجلی کی تیزی کے ساتھ اس کی زبان باہر نکل آتی ہے اور پلک جھپکتے اس کیڑے کو لیے منہ میں چلی جاتی ہے۔ مینڈکوں کا بھی یہی حال ہے ان کی زبان بھی خاصی طویل ہوتی ہے اور وہ بھی بڑی تیزی سے کیڑوں کو چٹ کر جاتا ہے۔

مور خوار تیز خوری کے چمپئن ہوتے ہیں جب وہ اپنے تیز پنجوں سے دیمک کا

گھر توڑتے ہیں اسی تیزی سے ان کی زبان اپنا کام شروع کر دیتی ہے ان کی ناک طویل ہوتی ہے۔اور اپنے منہ کے باہر اس طرح نکل آتی ہے جیسے کسی بندوق سے گولی اور پھر ان کی زبان پر ایک لیس دار مادہ لگا رہتا ہے۔

چنانچہ اس کی زبان کو دیمکیں چمٹ جاتی ہیں اور جب وہ زبان اندر کی طرف کھینچتا ہے تو ناشتہ کی لذت سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔

پرندوں کی زبانیں بھی کچھ ایسے انداز سے بنائی گئی ہیں جن پر غور کرنے سے قدرت کی کاری گری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔مثلاً ہدہد پر غور کیجئے۔اس کی زبان خاردار اور نوک چکنی ہوتی ہے جو اسے سڑے گلے درختوں کے اندر سے گودا نکالنے میں مدد دیتی ہے۔اسی طرح گنگناتی چڑیا کی زبان مشروبات پینے والی نلکی کی طرح ہوتی ہے۔اس لیے کہ وہ ایک پھول سے دوسرے پھولوں پر جاتی ہے اور اس زبان کی مدد سے پھولوں کی تہہ میں موجود شیریں رس چوس لیتی ہے

یہ چڑیا بہت چھوٹی ہوتی ہے یعنی دم سے لے کر چونچ تک اس کی لمبائی ڈھائی تین انچ سے زیادہ نہیں ہوتی اس کے باوجود وزنی ہونے کے سبب پھول اس کا وزن برداشت نہیں کر سکتا چنانچہ یہ پھول کے اطراف پھڑ پھڑاتی رہتی ہے۔ایسے وقت اس کی نلکی نما زبان رس چوسنے اور پینے میں کارگر ثابت ہوتی ہے۔

بحیرہ روم اور شمالی اوقیانوس کے کنارے ایل کی قسم کی ایک مچھلی پائی جاتی ہے جو لمپرے کہلاتی ہے اور جو اپنے شکار کا خون چوستی ہے اس مچھلی کی زبان بھی حیرت انگیز ہوتی ہے اس زبان کا عضلہ کافی مضبوط ہوتا ہے اور اس کی جھلی کانٹوں بھری یا خاردار ہوتی ہے۔اس زبان کی مدد سے وہ کسی چٹان سے اس طرح چمٹتی ہے جیسے سکشن پمپ یا پھر اپنے شکار سے اسی سکشن پمپ کے اصول کے تحت سارا خون چوس لیتی ہے۔

سبزی خور جانور جیسے زرافہ کی زبان بھی کوئی بیس انچ طویل اور پتلی ہوتی ہے۔اس زبان کی مدد سے وہ ہری بھری شاخوں کے اطراف گرہ لگا کر اس کے پتے بڑی تیزی سے کھا جاتا ہے۔

اگر دنیا میں وزنی اور بڑی زبان کا مقابلہ منعقد کیا جائے تو نیلی وہیل مچھلی یہ انعام جیت جائے گی کیونکہ اس کی زبان کا وزن چھ ہزار پونڈ ہوتا ہے اور یہ ایک سوفٹ لمبی مچھلی ہوتی ہے۔ ایک بار 98 اٹھانوے فٹ لمبی مچھلی کو تولا گیا تو اس کا وزن ہاتھی کے وزن کے برابر نکلا۔ اس کی زبان کی قوت وطاقت کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔

زبان کا استعمال صرف شکار کرنا، چوسنا، چیر پھاڑ کرنا ہی نہیں۔ بلکہ یہ زبان صفائی اور پہلی طبی امداد کے بھی کام آتی ہے۔ آپ نے بلی کو دیکھا ہو گا کہ ہر روز صبح اپنی زبان سے پورے جسم کی صفائی کرتی ہے۔ اور اگر کتا زخمی ہو جائے تو وہ زبان سے چاٹ چاٹ کر اپنے زخموں کو مندمل کر لیتا ہے۔ اگر آپ کا کوئی دانت ٹوٹ جائے تو نوک زبان اس خلا میں پھیرنے سے کیا آپ سکون محسوس نہیں کرتے؟

بحث کرنے کے زریں اصول......!

آپ ان اصولوں کو گرہ میں باندھ لیں

میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جو ہر بحث میں ایک دشمن بنا لیتا ہے۔ وہ بے حد ذہین ہے، ایک دلچسپ داستان گو ہے اور اس کا انداز گفتگو بڑا دلکش ہے۔ غرض یہ کہ اس میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو کسی انسان کو معاشرے میں ہر دلعزیز بنا سکتی ہیں۔

لیکن اسے کسی بھی مسئلہ یا موضوع پر کسی بحث میں الجھا دیجئے پھر وہ ان تمام خوبیوں کو بھلا کر اپنے حریف کو زیر کرنے کی سرتوڑ کوشش شروع کر دے گا۔ اپنے نکتۂ نظر یہ موقف کو درست ثابت کرنے کے لیے اتنی شدومد سے الجھ جائے گا کہ ہر قیمت پر مدمقابل کو قائل کرنے کی کوشش کرے گا۔ دلائل کے انبار لگا دے گا اور شدت جذبات میں لڑنے مرنے پر آمادہ نظر آئے گا۔

اپنی تمام تر توانائی اور صلاحیت کے ذریعے مدمقابل کو شکست دینے پر مائل

رہے گا اور اس پر ایسے تابڑ توڑ حملے کرے گا جیسے کوئی جنگ لڑ رہا ہو اور چونکہ کوئی بھی شخص بحث میں ایسے جارحانہ رویے کو پسند نہیں کرتا اس لیے ہر بحث میں وہ ایک دشمن بنا کر اٹھتا ہے۔

اور جب بحث کی جنگ کا دھواں چھٹ جاتا ہے تو وہ بیٹھ کر سوچتا ہے کہ آخر کیوں اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔ جو بھی شخص اس کو جانتا ہے اس کی ذہنی صلاحیت اور قابلیت کا اعتراف کرتا ہے۔ عام زندگی میں اس کی خوش اخلاقی کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ اس کے باوجود جب بھی وہ کسی سے بحث میں الجھ جائے تو یہ تمام خوبیاں ماند پڑ جاتی ہیں۔ وہ بحث میں کسی سے شکست برداشت نہیں کر سکتا اور مشکل یہ ہے کہ تمام تر کوشش کے باوجود کبھی کامیاب ہو کر بھی نہیں اٹھتا۔

اسی طرح اس سے بحث کرنے والا مقابل بھی کبھی لطف اندوز نہیں ہوتا نہ بحث سے کچھ حاصل کر کے اٹھتا ہے۔ دونوں اپنے اپنے موقف پر ڈٹے رہتے ہیں اور ہٹ دھرمی کے ساتھ کج بحثی کرتے ہیں جس کے نتیجے میں نہ خود کچھ حاصل کرتے ہیں نہ سننے والے ذہن کو متاثر کر سکتے ہیں۔

لیکن اختلاف رائے کا یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکلنا چاہیے۔ انتہائی گرما گرم بحث کو بھی مفید اور کارآمد مذاکرے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کے لیے تیار ہوں اور غصے کے بجائے معقولیت کا رویہ اختیار کریں، ہم اگر یہ طریقہ استعمال کریں تو ہر بحث میں دس میں سے نو مرتبہ کامیاب ہو کر اٹھ سکتے ہیں۔

یہ طریقہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا سقراط۔ اور شاید فنِ خطابت کی آسان ترین ترکیب ہے لیکن یاد رہے کہ اگر آپ نے اسے اتنی کامیابی سے استعمال کیا جتنا سقراط نے کیا تھا تو آپ بھی اسی کی طرح مصیبت میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔ یونان کے باشندوں نے سقراط کو عوام الناس کے لیے خطرہ قرار دے کر سزائے موت کا مستحق قرار دیا تھا۔

طریقہ یہ ہے کہ اپنے مخالف کو سوالات کر کے میدان میں لایئے۔ سقراط کا مشہور قول یہ ہے کہ "میں یقینی طور پر صرف ایک بات جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں

جانتا۔'' اس مقولے کو سقراط کا طنز کہا جاتا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن جاتا ہے۔

اس کے نتیجے میں مخالف کو ہر بات اس طرح سمجھانی تھی جیسے وہ کسی جاہل سے بات کر رہا ہو۔

سقراط ہمیشہ اپنے مخالف کو ایک استاد کی حیثیت دے کر نفسیاتی کیفیت پیدا کر دیتا تھا۔ ابتدائی سوالات بڑے آسان ہوتے جن کا جواب دینا بھی آسان ہوتا تھا لیکن بتدریج وہ مشکل سے مشکل تر ہوتے جاتے تھے۔ اور سقراط ان کے ذریعے اپنے مخالف کے عقائد اور موقف کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا تھا کہ دلائل اور بحث کے دوران تمام تضاد ابھر کر سامنے آ جاتے تھے جس کی روشنی میں اس کا مخالف جسے اس نے استاد کا درجہ دیا ہوتا تھا شرمسار ہو جاتا تھا کیونکہ اس کے دلائل بے وزن ہو جاتے تھے۔ اس دوران سوال کرنے والا جو اپنے ٹھوس عقائد اور نظریات کی بنیاد پر سوالات کر رہا ہوتا تھا بڑے اطمینان کے ساتھ بحث کو کامیابی کی سمت لے جاتا تھا اور اپنے اصلی نظریات کو ظاہر بھی نہیں کرتا تھا۔ وہ بظاہر اب بھی متجسس اور متلاشی نظر آتا ہے اور اپنے مخالف کے نظریات کو بے نقاب کر کے سامنے لے آتا تھا۔ اس کا مخالف اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے جتنے جوش و خروش سے ساتھ دلائل پیش کرتا تھا اتنا ہی ان کی خامیاں سوال کرنے والے پر عیاں ہو جاتی تھیں، یہاں تک کہ اس کے دلائل کا ذخیرہ ختم ہو جاتا تھا۔

یہ طریقہ کار آج بھی اتنا ہی مفید اور کار آمد ہے جتنا کہ پہلے کبھی ہوتا تھا اور اس کے لیے آپ کو سقراط جیسی بصیرت و استقلال کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سیدھا سادا آسان طریقہ ہے اپنے مخالف یا مدمقابل کو اپنے ترکش کے تمام تیر استعمال کر لینے دیجیے، اس طرح کہ اسے یہ احساس بھی نہ ہو کہ اس کا نشانہ کیا ہے اسے یہ اندازہ بھی نہ ہونے پائے کہ آپ بحث کو اس نکتے کی سمت لے جا رہے ہیں جہاں وہ جال میں پھنس جائے گا، ایک مرتبہ وہ منزل تک پہنچ جائے گا پھر آپ اپنے دلائل کے چند ٹھوس

ثبوت اور نپے تلے وار نشانے پر ٹھیک لگا کر اسے زیر کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سقراط کا یہ طریقہ کار بے حد سچا ہے۔ جو لوگ جوش میں آ کر اپنے مخالف سے براہ راست الجھ جاتے ہیں اور بحث کے دوران پے در پے دلائل دے کر ہر قیمت پر اپنا موقف منوانے پر مصر ہوتے ہیں ان کے دلائل میں وہ وزن باقی نہیں رہتا جو دوسرے کو قائل کر سکے۔ سچ پوچھیے تو ہم یہ رویہ عادتاً اختیار کرتے ہیں اور روزمرہ زندگی میں اس کے عادی ہو جاتے ہیں خواہ ہم لوگوں سے گفتگو کر رہے ہوں یا غور و فکر کر رہے ہوں، ہمارے ذہن میں پرورش پانے والے بیشتر نظریات اس وقت تک ہمیں بالکل درست نظر آتے ہیں جب تک تجزیے کی کسوٹی پر پرکھے نہیں جاتے اور جب وہ غلط ثابت ہوتے ہیں تو ہمیں دھچکا لگتا ہے۔ صرف اس وقت ہمیں اپنے عزیز نظریات پر شبہ ہونے لگتا ہے جب کسی بحث کے دوران ان پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ عام طور پر ہم ایسی صورت حال سے پہلو تہی کرتے ہیں جہاں ہمارے نظریات کو چیلنج کیے جانے کا خدشہ ہو۔

اختلاف رائے کی صورت میں ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے علاوہ مدمقابل کے دلائل میں بھی وزن ہے۔ ہم عموماً شکست سے بچنے کے لیے حقیقت کے اعتراف کے بجائے کج بحثی کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔

اگر آپ اپنے مخالف کے نظریات کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی خود بھی ایک بہترین تاثر چھوڑنا چاہتے ہیں تو مندرجہ ذیل اصولوں پر عمل کریں۔

سوالات کریں:

کیوں؟ وہ کیسے؟ اگر یہ درست ہے تو پھر اس قسم کے سوالات کر کے اپنے مخالف کے دلائل کو بے نقاب ہو کر سامنے آنے دیجیے لیکن سوال اتنی دیانتداری سے

کیجیے کہ مد مقابل یہ محسوس کرے کہ آپ حقیقت جاننے کے خواہش مند ہیں اور اس کی رائے اور نظریات میں بھرپور دلچسپی لے رہے ہیں۔ اس کو حقیر یا نادان تصور کرنے کے بجائے سقراط کی طرح "استاد" تصور کر لیجیے اور کرید کرید کر اس کے دلائل کا ذخیرہ سامنے لے آیئے۔ اسے اصل موضوع سے اِدھر اُدھر نہ بھٹکنے دیجیے ورنہ بحث کا سلسلہ لامتناہی ہو جائے گا۔

۲۔ اپنے مزاج پر قابو رکھیے

سوالات بڑی نرمی سے لیکن مستقل مزاجی اور مضبوطی کے ساتھ کیجیے۔ آپ کو اس کے بعض خیالات اور نظریات سے شاید اختلاف ہوگا لیکن اس بناء پر اشتعال میں نہ آیئے اپنے مزاج اور جذبات کو پوری طرح قابو میں رکھیے اور اپنے لہجے میں جارحیت ہرگز نہ آنے دیجیے۔ اگر آپ نے جارحیت کا لہجہ اختیار کیا تو یہ جلتی پر تیل کا اثر دکھائے گا اور اپنے مقابل کو طیش دلا کر آپ کچھ نہ حاصل کر سکیں گے۔ بہتر یہی ہوگا کہ آپ دوستانہ فضا کو قائم رکھیں کیونکہ اس طرح آج نہیں تو کل آپ اسے قائل کر سکیں گے۔

۳۔ زیرِ بحث مسئلہ کی مرکزیت قائم رکھیے

اس بنیادی مفروضے کی سمت آنے کی کوشش کیجیے جس کے سہارے آپ کا مخالف کسی بات کو درست ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے، آخر کار وہ اس نکتے تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس سے اس کی جذباتی وابستگی ہے اور وہ اسے منطقی طور پر ثابت کرنا چاہے گا۔

ایسی صورت میں آپ صرف اپنے جذبات پر قابو رکھیں اور اسے گھما پھرا کر اس بنیادی مفروضے تک لے آئیں۔ اسے کسی ایک نکتے کو بار بار دہرانے کا موقع نہ دیں۔ سوالات کے ذریعے اس کی توجہ کو اصل موضوع یا مسئلہ پر مرکوز رکھیں اور اس طرح بتدریج کرید کرید کر اس کے ذہن میں پوشیدہ تمام استدلال سے آگاہی حاصل کریں۔

۴۔ جب مسئلہ واضح ہو جائے

جب مسئلہ واضح ہو جائے اور مدمقابل اپنے اصلی ہدف تک اس طرح پہنچ جائے کہ زیر بحث موضوع کی حمایت میں اس کے تمام دلائل ختم ہو جائیں تو پھر اپنے سب سے اہم دلائل کو پیش کر کے اسے قائل کر لیجیے۔

اس موقع پر آپ کے دلائل زیادہ گہرا اثر چھوڑیں گے اس کے برخلاف اگر آپ ابتداً اسے اپنے دلائل پیش کرنا شروع کر دیتے تو اتنے مؤثر ثابت نہ ہوتے۔ آپ نے صرف یہ کیا ہے کہ اپنے مدمقابل کو اپنا موقف پوری طرح پیش کرنے میں مدد دی ہے۔ اب جب کہ وہ اپنے دلائل کے ترکش کے تمام تیر خالی کر چکا ہے تو اس کی حالت ایک نہتے مخالف کی ہو چکی ہے، ایسے میں آپ کے وزنی دلائل کا ہر تیر نشانے پر بیٹھے گا اور آپ کا مدمقابل لاجواب ہوگا اور آپ اسے بڑی آسانی سے شکست دے کر بحث کو تمام کر سکیں گے۔

یہ طریقہ "سقراط" سے منسوب ہے جس نے زندگی کے آخری لمحہ تک اپنے جذبات پر قابو رکھا اور اپنے تمام مخالفین کو پرسکون انداز میں حقائق اور دلائل کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش کی۔

۵۔ لیکن اپنے ذہن کو کھلا رکھیے۔

ممکن ہے آپ کے مخالف کا موقف یا نظریہ درست ہو۔

بحث میں ہٹ دھرمی کے رویے سے اپنے موقف کو منوانے کی کوشش آپ کے دشمنوں میں تو اضافہ کر سکتی ہے لیکن آپ کو حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ اگر آپ کے مخالف کا موقف درحقیقت درست ہو تو اسے خندہ پیشانی سے تسلیم کر لینا چاہیے۔ اس طرح آپ اس کا دل جیت لیں گے اور بحث میں شکست کے باوجود آپ کی یہ جیت زندگی میں ہر دلعزیزی اور کامیابی کی راہ ہموار کرے گی۔

قطع تعلق ہمیشہ قبل از وقت ہوتا ہے

آئینہ خانے میں ذات کی تلاش کا پہلا مرحلہ مایوسی اور شکست خوردگی کے اسباب اثرات اور تدارک سے شروع ہوتا ہے۔ انسان معاشرے میں مایوسی سے اسی وقت دوچار ہوتا ہے۔ جب کسی بھی معاملے میں کوئی نتیجہ اس کی توقعات کے مطابق نہ نکلے اور وہ اس نتیجہ کو حتمی سمجھ کر اپنی کوششیں ترک کر دے۔ تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ جائے اور اپنی ناکامی پر آنسو بہانے کے ساتھ ساتھ اس کے لیے کسی جواز کو بھی پیدا کرتا رہے۔ ہم میں سے بے شمار افراد ایسے ہیں جو کسی بھی کام میں ناکامی کا ذمے دار اپنی قوت فیصلہ حکمت عملی یا ناقص منصوبہ بندی کو نہیں ٹھہراتے بلکہ بیرونی عوامل کو کوستے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک طالب علم امتحان میں ناکامی پر اپنے اساتذہ کو بھلا برا کہتا ہے جنھوں نے پرچہ اس کی خواہشات کے مطابق ترتیب نہیں دیا اور امتحان کی آڑ میں اس

کے ساتھ کسی پرانے انتقام کا ارتکاب کیا، جبھی وہ فیل ہو گیا۔ یا ایک کلرک اکثر اپنی تقدیر کو ترقی نہ ہونے کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے افسران سے انتقام کے منصوبے بناتا رہتا ہے اور بالآخر ناکام و مایوس ہو کر پھر اپنی جگہ بیٹھ جاتا ہے۔ یا ایک دکاندار مستقل نقصان سے تنگ آ کر کسی سفلی علوم کے توڑ کے ماہر بابا سے رجوع کرتا ہے اور مزید پیسہ برباد کر کے بالآخر دکان بند کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان تمام مثالوں میں مشترک قدر کسی خفیہ بیرونی ہاتھ کی ہے جو ہماری تمام تر کوششوں کو ناکام بنا دیتا ہے یہ ہاتھ ہماری راہ میں روڑے اٹکاتا ہے۔ جب تک یہ موجود ہے۔ ہم دنیا کے کسی بھی کام میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اور اسے بخیر و خوبی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے۔ پس ہمیں جدوجہد ترک کر کے اپنی تقدیر کو کوسنا چاہیے اور مزید مایوسی سے بچنے کے لیے آئندہ کسی بھی کام میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے۔

درحقیقت فکر و عمل کا یہ انجماد ہی ہماری راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے والا سب سے بڑا خفیہ ہاتھ ہے۔ غیر ثابت قدمی، عدم استقلال، ارادے کی کمزوری سب اسی زمرے میں آتے ہیں۔ لوگ اپنے کاموں میں ناکامی کے بعد دوبارہ اسے کامیاب بنانے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور کوشش ترک کر دیتے ہیں۔ وہ بھرپور متوقع نتیجے کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں اور یہی مایوسی انہیں لے ڈوبتی ہے۔

آپ کی زندگی یقین محکم اور عمل پیہم کا دستور چاہتی ہے۔ کامیابی کے لیے اس دستور کا استعمال زمانہ قدیم سے ہی انسانی معاشرے میں موجود رہا ہے۔ بڑی بڑی نامور شخصیات، فلسفی اور جرنیل اس اصول پر کاربند رہے اور انسانی عظمتوں کی معراج پر پہنچ گئے۔ انہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں جدوجہد کی۔ انجام سے بے پروا ہو کر محنت کی اور بالآخر اپنی منزل پا لی۔

نہ جانے کتنی ہی مثالیں ہیں جو ہمارے لیے آج بھی مشعل راہ ہیں۔ ایک حدیث شریف میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

"خدا ان کے ساتھ ہے جو ثابت قدم رہتے ہیں۔"

اس ایک چھوٹی سی بات میں عزم اور جدوجہد کی پوری داستان چھپی ہوئی ہے۔ آپ مشکلات سے کبھی بھی آزردہ خاطر مت ہوں۔ اپنے ارادے، ہمت کو پست مت ہونے دیں۔ اس لیے کہ "مایوسی" مکمل شکست کی علامت ہے۔ یہ "مایوسی" صرف اس معاملے تک ہی محدود نہیں رہتی جس میں آپ ناکام ہوئے ہیں بلکہ رفتہ رفتہ آپ کی پوری شخصیت کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے اور اسے شکست دے دیتی ہے۔ یہ "مایوسی" آپ کی پوری نفسیات کو شکستہ بنا دیتی ہے۔

اس "مایوسی" سے نمٹنے کے لیے مسئلہ کو ہمیشہ ایک دوست کی مانند تصور کیجیے جو ذرا سے بھی غلط طرزِ عمل سے ناراض ہو جاتا ہے۔ آپ اپنے اس دوست کو اپنے اوپر سوار مت کیجیے بلکہ ہمیشہ اس کی خاطر تواضع ایک نئے انداز سے کیجیے اگر کوئی مسئلہ آپ کے اختیار کیے ہوئے کسی ایک طریقے سے حل نہیں ہو رہا ہو تو اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ آپ کوئی دوسرا ڈھنگ اختیار کریں۔

مایوسانہ گفتگو سے پرہیز کریں

مسائل زندگی کے کھیل کا حصہ ہیں۔ ان سے نمٹنے کے لیے اپنے اندر اسپورٹس مین اسپرٹ پیدا کریں۔ انہیں فراخدلی سے قبول اور خوش مزاجی سے حل کریں۔ اور اسپورٹس مین اسپرٹ پیدا کرنے کے لیے لازمی ہے کہ آپ مایوسانہ گفتگو سے اجتناب برتیں۔ شکست خوردہ گفتگو یا الفاظ کا استعمال ہی دراصل آپ کی شکست ہے۔ اور شکست کی قبولیت کے لیے آپ کے ذہنی رجحان کا مظہر ہے۔ لہٰذا اپنا حوصلہ

جوان رکھنے کے لیے ہمیشہ اچھے الفاظ اور جملے استعمال کریں۔ ایسے الفاظ جن سے امید، یقین، اعتقاد اور فتح کی خوشبو آئے، ناکام ہونے پر بھی مایوس نہ ہوں۔ ناکامیاں زندگی میں آتی جاتی رہتی ہیں۔ ان سے گھبرا کر اپنا انداز فکر تبدیل نہ کیجیے۔ آپ کے آدھے مسائل اسی وقت حل ہو جائیں گے اور آپ اپنی سوچ میں خود بخود ایک واضح تبدیلی محسوس کرنے لگیں گے۔

دوسری طرف! ''ہاں'' پر غور کیجیے۔ کتنا دلفریب، مترنم، امید افزا، لفظ ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی نازک سی، شرمائی ہوئی حسینہ کا دھیرے سے اظہار محبت، جیسے جل میں کنول کھلنے کا منتظر، جیسے صبح دم کھلے گلاب پر لرزتا ہوا شبنم کا قطرہ روح کو تازگی بخشتا ہوا۔ لمحۂ آئندہ کا یقین دلاتا ہوا۔ ارادے کی پختگی اور چیلنج کو قبول کرنے کا اعلان کرتا ہوا۔ گویا سر کی، اوپر سے نیچے جنبش، بجلی کی چمک ہے جو آسمان تا زمین لہراتی ہے اور دیکھنے والوں پر ہیبت طاری کر دیتی ہے۔

آپ نے غور کیا کہ صرف ان دو لفظوں کی ادائیگی سے ہی آپ کے محسوسات میں کتنا بڑا تغیر رونما ہوتا ہے! ''نہیں'' آپ کو مسائل سے چھپنے کی ترغیب دیتا ہے۔ پیچھے کھینچتا ہے۔ جب کہ ''ہاں!'' مسائل سے سینہ ٹھونک کر ٹکرا جانے کی طاقت بخشتا ہے۔ آگے بڑھنے میں مدد دیتا ہے۔ غرض مثبت انداز فکر مسائل حل کرنے میں لوگوں کی مدد کرتا ہے اور ثابت قدمی اسے جلا بخشتی ہے۔ لہٰذا تعمیری سوچ رکھیے۔ اس طرح کیا گیا ہر فیصلہ آپ کی زندگی کے دھارے کو تبدیل کر سکتا ہے۔

مستقل مزاجی اپنائیے

مایوسی کے آگے سرنگوں نہ ہونا درحقیقت مستقل مزاجی ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا کہ کسی بھی انسان کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ اپنے اندر

ناکامی کو برداشت کرنے کی کتنی صلاحیت رکھتا ہے اور اس میں اپنا عزم پورا کرنے کا کتنا جذبہ ہے۔ جو شخص نامرادی سے نہیں گھبراتا بلکہ اولوالعزمی سے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے پینترے بدلتا رہتا ہے، ترکیبیں اختیار کرتا ہے وہی زندگی میں کامیابی کا حقدار ہوتا ہے۔ یہ ثابت قدمی ہی بتاتی ہے کہ کسی شخص میں زندگی سے لڑنے اور اپنا مقام بنانے کے لیے کتنی خواہش موجود ہے۔ اس کے بغیر آدمی زندگی کے کسی بھی شعبے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

مستقل مزاجی کی تازہ ترین مثال پاکستانی باکسر محمد حسین شاہ ہے۔ جس نے سیول اولمپکس میں کانسی کا تمغہ حاصل کیا۔ حسین شاہ کراچی کے پس ماندہ علاقے لیاری میں پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا۔

معاشی مجبوریوں نے ہمیشہ اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن اس نے حالات کے آگے سر نہ جھکایا اور اپنے بچپن کے شوق یعنی باکسنگ کو دھیرے دھیرے آگے بڑھاتا رہا، اس سلسلے میں اسے فاقے بھی کرنے پڑے اور ماں باپ سے مار بھی کھانی پڑی لیکن اس نے اور مقامی باکسنگ کوچ سے تربیت حاصل کرتا رہا۔

بھرپور اور متوازن غذا، اعلیٰ تربیت اور معیاری ساز و سامان نہ ہونے کے باوجود رفتہ رفتہ اس کے کھیل میں اتنا نکھار آ گیا تھا کہ اسے سیول اولمپکس کے لیے باکسنگ ٹیم میں شامل کر لیا گیا۔ جہاں اس نے اپنی نمایاں کارکردگی سے ساری دنیا کو چونکا دیا تھا۔ یقیناً ایسی بے سروسامانی کے عالم میں یہ کارکردگی کسی معجزے سے کم نہ تھی۔ مگر یہ معجزہ کسی اور کا نہیں، صرف مستقل مزاجی کا ہی مرہونِ منت تھا۔ اس نے متواتر کوششیں کی اور کامیاب ہو گیا۔ آپ بھی ہمت مت ہاریے۔ ڈٹے رہیے اپنے محاذ پر۔ اور زندگی کے رنگ میں سونے کا تمغہ حاصل کریں۔

اپنے فیصلوں کا تجزیہ کریں

کسی بھی فیصلے کی ناکامی یا کامیابی کا دارومدار بڑی حد تک خود ہم پر عائد ہوتا ہے آیا ہم معاملے کے ہر پہلو کو مدنظر رکھتے ہیں یا کسی پہلو کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔

اپنے فیصلوں پر پشیمانی سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم باقاعدگی سے اپنے فیصلوں کا تجزیہ کرتے رہیں اور اگر ہم ناکام ہو گئے ہیں تو پوری فراخدلی کے ساتھ اس ناکامی کے اسباب پر غور کریں۔

اس تجزیے کے لیے ہمیں اپنے آپ کو یا اپنے فیصلے کی روشنی میں متعلقہ صورت حال کو سمجھنا لازمی ہے۔ بہترین تجزیے کے لیے ہمیں ہر چیز کشادہ ذہن سے تسلیم کرنی پڑتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ناکام افراد کی زندگی ان کی اپنی حرکات کی بنا پر یہ رخ اختیار کرتی ہے۔ اور ان سے بیشتر اپنے آپ کے دشمن کہے جا سکتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو صحیح طور نہیں پہچان پاتے اور ارادے رکھنے کے باوجود ان پر عمل پیرا نہیں ہو جاتے۔

دراصل اس دنیا میں وہ چیز جو زیادہ مشکل سے سمجھ میں آتی ہے۔ انسان کی اپنی ذات ہے۔ اس ذات کے لاتعداد پہلو ہیں۔ اور ہر پہلو ایک آئینہ ہے۔ یہ آئینہ انسان کی ہر سوچ کی شکل ہر لمحہ منعکس کرتا رہتا ہے۔ ہلکی، گہری، رنگین، بے رنگ، جاں فزاء، دہشت ناک، ذات کے آئینے خانے میں ہر سوچ اپنی منفرد صورت رکھتی ہے۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ ہم ان صورتوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور ذات کے آئینہ خانے میں نظر نہیں کرتے۔ ہم اپنی ان سوچوں، خوبیوں اور صلاحیتوں سے واقف نہیں ہو پاتے جو ہمارے اندر موجود ہوتی ہیں۔ اور پھر زمانے سے اپنی ناکامی یا ناقدری کا شکوہ کرتے ہیں۔

اس ذاتی بے خبری کی وجہ انسان کی معاشی و معاشرتی پریشانیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ جب صبح و شام کے جھمیلوں میں اسے اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ وہ اپنے آپ کو سمجھ

سکے اور صحیح مقام پر لے جا سکے۔اور اس کی وجہ نفسیاتی بھی ہو سکتی ہے۔ہمارے اطراف میں کتنے ہی افراد ہیں جو اپنے آپ کو سمجھنا نہیں چاہتے وہ دوسروں کے متعلق گفتگو کر لیں گے۔ان کے مسائل پر زور وشور سے بحث کر لیں گے۔

لوگوں کے مسائل کا تیر بہدف نسخہ بھی ہر لمحہ ان کے پاس ہوتا ہے۔لیکن یہ لوگ اپنے مسائل پر نظر نہیں کرتے۔انہیں اپنے مسائل نظر ہی نہیں آتے درحقیقت یہ لوگ! ''سچائی'' سے گھبراتے ہیں اور خود کو اپنے آپ سے چھپاتے ہیں۔

یہ لوگ اپنے اعمال وافعال کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔مبادا تجزیہ کر کے جو کچھ وہ پائیں۔وہ ان کے فیصلوں پر طمانچہ ثابت ہو اور ان کی خود ساختہ انا کی دیوار یکدم ریت کے گھروندے کی مانند ڈھے جائے۔لہٰذا یہ لوگ گھونگے کی مانند ایک مضبوط خول میں بند رہتے ہیں۔یہ نہ تو خود اپنے اندر کے آئینہ خانے میں نظر کرتے ہیں نہ ہی کسی دوسرے کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں۔اسی لیے ان کے افعال تجزیے کی کسوٹی سے عاری ہوتے ہیں اور عموماً ان کے فیصلے ناکام ثابت ہوتے ہیں۔

ہمت جواں رکھیے

منصوبے کے انجام سے پہلے ہی مایوس ہو جانے والا رویہ بھی کسی فرد کی زندگی کی ناکامی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔اس نے اپنے ذہن سے اندازے لگا کر نتائج تصور کر لیے اور دل گرفتہ ہو کر خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا۔یہ رویہ بہت غلط ہے۔اس لیے کہ کسی بھی فرد میں مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اگرچہ اندازے بھی مستقبل میں دیکھنے کی ایک کوشش ہیں لیکن یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ کوئی فرد مستقبل کے بارے میں سو فیصد درست اندازے لگائے۔اور بعد میں وہی حالات رونما ہوں جیسے کہ اس نے اپنے ذہن میں سوچے تھے۔اندازوں میں اونچ نیچ ہوتی رہتی

ہے۔آپ کے اندازے غلط ثابت ہو سکتے ہیں اور آپ کو ان کی بدولت نقصان بھی ہو سکتا ہے۔لیکن یہی وہ وقت ہوتا ہے جب آپ اپنی سوچ کے ذریعے بازی جس رخ چاہیں پلٹ سکتے ہیں۔جب ہر چیز آپ کے حساب سے الٹی جارہی ہو تو اس وقت آپ کو سب سے زیادہ ضرورت ثابت قدمی، غور و فکر اور جہدِ مسلسل کی ہوتی ہے۔آپ کو ذہنی طور پر یہ یقین ہونا چاہیے کہ دیر آید درست آید۔راستہ دھندلا ہو تو آپ سفر ترک نہیں کرتے بلکہ آگے بڑھتے رہتے ہیں۔

یہ تمام گفتگو اس وقت تک لاحاصل ہے۔جب تک آپ ان نکات سے اچھی طرح واقف نہ ہو جائیں جن پر ہم نے اس کی بنیاد رکھی ہے۔ظاہر ہے آپ کے لیے ان تمام طویل باتوں کو ذہن نشین کرنا ایک مشکل امر ثابت ہوگا۔لہٰذا ہم اپنی اس بحث کو چند جملوں میں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔

☆ کسی بھی مسئلے سے نبرد آزما ہوتے وقت مایوس مت ہوئیے۔اس کے حل کے لیے طریقے موجود ہیں۔انہیں تلاش کیجیے۔

☆ یاد رکھیے۔مسئلہ چاہے کتنا بڑا ہی کیوں نہ ہو آپ کے غور و فکر کے آگے کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔

☆ شکست خوردہ گفتگو مت کیجیے۔ایسے جملے استعمال کریں جو آپ کے ارادے کو فولادی بنا دیں۔

☆ مایوسی سے بچنے کے لیے اپنا اور اپنے فیصلوں کا تجزیہ کیجیے۔

☆ اپنے آپ کو پہچانیے۔اس شخص کو بیدار کیجیے۔جو آپ میں کمبل لپیٹے سو رہا ہے۔

☆ اگر آپ ایک بار ناکام ہو گئے ہیں تو پھر دوبارہ کوشش کیجیے۔پھر بھی نہیں تو تیسری بار۔پھر بھی نہیں تو......!

☆ حالات سے شکست مت کھائیے۔حالات کو شکست دیجیے۔حالات صرف کمزور ارادے کے لوگوں کو دباتے ہیں۔آپ کمزور نہیں ہیں۔حالات کو دبائیے۔

اپنے کردار کو جلا دیجیے

کردار کی تعریف ایک بڑے مشہور فلسفی نے یہ کی ہے کہ یہ اس اخلاقی حسن ترتیب کا نام ہے۔ جس کا مظاہرہ کسی فرد کی ذات سے ہو، اعلیٰ کردار کے لوگ معاشرے کا ضمیر ہوتے ہیں۔ کردار جب اچھا ہوتا ہے تو انسانی فطرت کا ایک بہترین نمونہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے کیونکہ کردار ہی سے انسان کی عظمت اور بلندی کا پتا چلتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں جو لوگ محنتی، ایماندار اور بااصول ہوتے ہیں انہیں ہمیشہ عزت حاصل ہوتی ہے۔ اس قسم کے لوگوں پر بھروسہ کرنا بالکل فطری بات ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان کے نقشِ قدم پر چلا جائے۔ وجہ یہی ہوتی ہے کہ ایسے لوگ تمام اچھی باتوں کی قدر کرتے ہیں۔ دنیا میں ایسے لوگ اگر باقی نہ رہیں تو پھر یہ دنیا بالکل جہنم بن جائے۔ جینا دوبھر ہو جائے۔

اس میں شک نہیں کہ قابل آدمی کو دیکھ کر بعض لوگ اس کی تعریف کرنے لگتے ہیں۔ لیکن اعلیٰ کردار آدمی کی ہر شخص ہر وقت عزت کرتا ہے۔ تعریف کرنا ایک دماغی اور ذہنی فعل ہے مگر عزت دل سے کی جاتی ہے اور زندگی پر آخر میں حکمرانی اگر کسی کی قائم رہتی ہے تو وہ شے ہے دل۔ قابل لوگ ذہنی اعتبار سے تو معاشرے میں ممتاز رہتے ہیں۔ مگر صاحب کردار ہستیاں سماج کے لیے ایمان کا درجہ رکھتی ہیں۔ قابلیت سے متاثر ہو کر مدح خوانی تو ہو سکتی ہے۔ لیکن تقلید اور اتباع ہوتا ہے صرف کردار کا۔

بڑے آدمی ہمیشہ معمولی قسم کے ہوتے ہیں اور خود بڑائی بھی ایک نسبتی شے ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عام آدمی کی زندگی اتنی محدود ہے کہ بہت کم لوگوں کو بڑا آدمی ہونے کا موقع ملتا ہے۔ لیکن اس سے بددل ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ ہر شخص جب حیثیت ایمانداری اور عزت سے اپنے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ اور جو نعمتیں اور صلاحیتیں

اللہ نے عطا کی ہیں انہیں صحیح طور پر استعمال کر سکتا ہے۔ ایک شخص معمولی معمولی باتوں میں بھی سچا اور ایماندار رہ سکتا ہے۔

بہ الفاظ دیگر ہر ایک اپنی بساط کے مطابق اپنے فرائض ادا کر سکتا ہے۔ خواہ وہ غریب ہو یا امیر!

فرائض کی ادائیگی یوں تو روزمرہ کے کاموں کے سلسلے میں ہوتی ہے مگر اس سے اعلیٰ کردار کے لوگوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کے پاس نہ روپیہ ہوتا ہے نہ جائیداد۔ نہ کالج کی بڑی بڑی ڈگریاں ہوتی ہیں اور نہ اونچا عہدہ۔ پھر بھی یہ لوگ ایماندار اور سچے ہوتے ہیں۔ ان کا دل ہمیشہ مضبوط رہتا ہے۔ لہٰذا جو شخص اپنے فرض کو ایمانداری کے ساتھ ادا کرتا رہتا ہے وہ اس مقصد کی تکمیل کرتا رہتا ہے۔ جس کے لیے قدرت نے اسے پیدا کیا ہے۔

اور اس طور سے وہ مردانہ وار اچھے اصولوں کی پرورش کرتا رہتا ہے۔ بہت سے لوگ دنیا میں ایسے بھی ہیں جن کے پاس سوائے ان کے کردار کے کوئی اور شے نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے کردار کے سہارے اس شان سے رہتے ہیں۔ کہ جیسے بادشاہ بے ملک ہوں۔

دولت اور کردار کا قطعی کوئی تعلق نہیں بلکہ دولت کی بدولت تو اکثر خرابی اور ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بدی اور عیش و عشرت کا بالکل چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کم ظرف اور نکمے لوگوں کے ہاتھوں میں جب دولت آ جاتی ہے۔ تو اس سے عموماً خود ان کو بھی نقصان پہنچتا ہے اور دوسروں کو بھی۔

اس کے برعکس غربت میں کردار کے جوہر کھلتے ہیں۔ ایک غریب دیانت دار اور کفایت شعار آدمی میں وہ تمام خوبیاں پائی جا سکتی ہیں جن کی بنا پر انسان فخر سے اپنا سر بلند کر سکتا ہے۔ کردار بذات خود ایک امارت ہے، اس سے بڑی امارت اور کیا ہو سکتی ہے جو عوامی عزت اور مقبولیت پر مشتمل ہو۔ اس امارت کے لیے جو لوگ سرمایہ لگاتے ہیں وہ مادی اعتبار سے تو دولت مند نہیں ہوتے لیکن عزت و شہرت سے وہ ہمیشہ مالا مال رہتے

ہیں۔انسان کی سیدھی سادھی ایمانداری بھی اس کے واسطے بڑی مفید ہوتی ہے بشرطیکہ وہ اپنے بارے میں صحیح اندازے لگائے اور راہ راست پر گامزن رہے۔اس سے ہمت برقرار رہتی ہے اور انسان عمل کے لیے ہمیشہ مستعد رہتا ہے۔لیکن ایمانداری کے ساتھ ساتھ انسان کا مقصد بھی صحیح اصولوں پر مرتب ہونا چاہیے اور اس کے حصول کے لیے راست بازی اور سچائی ہی کو آلۂ کار بنانا چاہیے۔اگر اصول صحیح ہیں تو پھر انسان اس کشتی کی مانند ہے جس میں چھید نہیں ہیں پھر تو وہ ہوا کے ہر تھپیڑے کے ساتھ رواں دواں رہے گی۔

ذہانت کی بھی دنیا میں کوئی کمی نہیں۔یہی حال قابلیت کا بھی ہے،لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ذہانت پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے یا قابلیت پر؟ صاف ظاہر ہے کہ جب تک صداقت اور راست گوئی نہ ہو ان چیزوں پر ہرگز بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔لہٰذا ثابت یہ ہوا کہ یہی وہ صفت ہے جس کی بدولت لوگ عزت اور اعتماد کرتے ہیں۔راست بازی ہر ذاتی خوبی میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔رفتار،گفتار ہر بات سے اس کا مظاہرہ ہوتا ہے ہر فعل و عمل میں یہ درخشاں رہتی ہے اور اس کے معنی ہیں بھروسہ اور اعتماد۔ دوسروں کو اسی بنا پر یقین آ جاتا ہے کہ ہاں اس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

تو صرف یہی ایک بات اس شخص کو ممتاز اور مشہور کر دیتی ہے۔کیونکہ جب وہ کہتا ہے کہ میں فلاں بات جانتا ہوں تو اسی کو جانتا ہے اور جب وہ کہتا ہے کہ میں فلاں کام کروں گا تو پھر واقعی وہ اس کام کو کر بھی دیتا ہے اور یہی اعتماد اور بھروسہ ہر ایک کے دل میں جگہ بنا لیتا ہے اور ہر شخص اس آدمی کی عزت کرنے لگتا ہے۔

زندگی کے ہر معاملے میں ذہانت کا اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا کہ کردار کا۔دماغ کے بجائے دل اور قابلیت کے بجائے ضبط و تحمل،صبر و استقامت کی اہمیت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔لہٰذا زندگی کے لیے اس سے بہتر زادِ راہ بھلا اور کیا ہو سکتا ہے کہ تھوڑی سی سوجھ بوجھ ہو اور اس کی رہنمائی کے لیے راست بازی ہو سوجھ بوجھ کے ساتھ ساتھ جب تجربہ بھی حاصل ہو جاتا ہے اور اس کے لیے مشعلِ راہ جب نیکی بن جاتی ہے تو اس سے آدمی کو عملی دانائی حاصل ہو جاتی ہے۔یوں نیکی کے ساتھ دانائی کا بھی کچھ حصہ شامل سمجھا

جاتا ہے۔ لیکن اصل دانائی وہی ہے جس میں دین و دنیا دونوں کا خیال رکھا جائے ایک فلسفی نے خوب کہا ہے کہ نیکی اور دانائی کے تعلقات تو بہتیرے ہیں اور یہ تو سمجھ ہی لینا چاہیے کہ ایک کے ساتھ دوسری ضرور وابستہ ہوگی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ آدمی عقلمندی کی بنا پر نیک ہو جاتا ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ نیکی کی بدولت انسان عقلمند بن جاتا ہے۔

چنانچہ کردار کی یہی ہمہ گیر تاثیر ہے جس کی بدولت اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض لوگ اپنی دماغی صلاحیتوں کے تناسب سے بھی کہیں زیادہ اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان لوگوں کے اندر کوئی مخفی طاقت پوشیدہ ہے جس کی وجہ سے ان کا ہر فعل و عمل کامیاب رہتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ان لوگوں کے پاس ایک ایسا محفوظ خزانہ یا قوت ہوتی ہے جو اندر ہی اندر کام کرتی رہتی ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ صرف ان کی موجودگی ہی سے دوسرے لوگ متاثر اور مطیع ہو جاتے ہیں۔ اصل راز اس میں یہ ہے کہ اس قسم کے لوگوں کے بارے میں دوسرے لوگ ہمیشہ یہی محسوس کرتے ہیں کہ ان کے مقاصد نیک ہیں۔ لہٰذا دوسرے مجبور ہو جاتے ہیں اور ان کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔

ایک مفکر نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ ایسے لوگوں کی نیکیاں ہی ان کا سرمایہ ہوتی ہیں۔

اعلیٰ کردار لوگوں کی شہرت تو آہستہ آہستہ ہی پھیلتی ہے۔ مگر ان کی سچی خوبیوں کو کبھی نہیں چھپایا جا سکتا۔ ممکن ہے کہ کچھ لوگ ان کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں۔ غربت و افلاس کی وجہ سے کچھ دنوں کے لیے یہ لوگ پریشان ہو سکتے ہیں لیکن ان کے صبر و تحمل کی وجہ سے کچھ دنوں کے لیے یہ لوگ پریشان ہو سکتے ہیں لیکن ان کے صبر و تحمل کی وجہ سے آخر کار دوسرے ان کی عزت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

کردار کی تعمیر مختلف چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوتی ہے اور یہ سب کم و بیش خود انسان کے اختیار میں ہوتی ہیں۔

کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جب کہ ان باتوں کی تربیت نہ ہوتی ہو کتنا ہی معمولی سا

فعل کیوں نہ ہو اس کے نتائج ہمیشہ برآمد ہوتے ہیں۔

ہر فعل اور ہر خیال و احساس سے انسان کے مزاج، اس کی عادات اور سمجھ بوجھ پر اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ مستقبل کے ہر فعل پر اس کا اثر پڑنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کردار میں برابر تبدیلی ہوتی رہتی ہے، خواہ وہ اچھائی کی طرف ہو یا برائی کی طرف اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کردار یا تو اعلیٰ ہوتا جاتا ہے یا پھر گرتا جاتا ہے۔

یوں تو یہ ایک میکانیکی قاعدہ ہے کہ عمل اور جوابی عمل برابر ہوتے ہیں مگر یہ قاعدہ اخلاق کے سلسلے میں بھی درست ہے۔ اچھے افعال کا عمل اور جوابی عمل فعل کرنے والے پر بھی ہوتا ہے۔ یہی صورت ہوتی ہے برے افعال کی۔ یہی نہیں جن لوگوں کے ساتھ جو کچھ کیا جاتا ہے۔ اس کا ان پر بھی اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ ان کے لیے وہ فعل ایک نمونہ بن جاتا ہے۔ انسان حالات کے اختیار میں اس حد تک نہیں ہوتا جتنا کہ خود حالات اس کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی قوت ارادی کے استعمال سے اپنے افعال کی رہبری اس طرح کر سکتا ہے کہ ان سے برائی کے بجائے بھلائی پیدا ہو۔

اعلیٰ کردار بغیر کوشش کے نہیں بنتا اور کوشش کے لیے قوت ارادی سب سے زیادہ ضروری ہے انسان کو ہر لمحہ اپنی نگرانی کرنے کی ضرورت ہے، اسے اپنی ذاتی تربیت کرنا پڑتی ہے اور ضبط سے کام لینا پڑتا ہے۔ بعض اوقات قدم ڈگمگاتے بھی ہیں اور کہیں ٹھوکر بھی لگتی ہے اور عارضی طور پر ہزیمت بھی اٹھانا پڑتی ہے۔ طرح طرح کی دشواریاں بھی سامنے آتی ہیں اور مختلف اقسام کے لالچ پر بھی قابو حاصل کرنا ہوتا ہے لیکن اگر قوت ارادی ہے اور دل میں نیکی ہے تو پھر آخر کار کامیابی لازمی ہے۔ ترقی کی راہ پر آگے اور آگے چلنے کی صرف کوشش ہی کرنا یعنی کردار کی جس بلندی پر پہنچ چکے ہیں، اس سے آگے بڑھنے کی سعی کرنا بھی بذات خود ایک نہایت ہمت افزاء فعل ہے اور اگر بالفرض آخری بلندی تک کسی وجہ سے نہ بھی پہنچ سکے تب بھی ہر ایماندارانہ کوشش کے ساتھ کردار بہتر ہوتا جائے گا اس میں کوئی بات مانع نہ ہوگی۔

نیک اور اچھے لوگوں کی زندگی کو اگر پیش نظر رکھا جائے یعنی وہ لوگ جو انسانیت

کے بہترین نمونے کہے جا سکتے ہیں تو پھر ہر شخص کے لیے کردار کے بہترین معیار تک پہنچنا کوئی مشکل نہیں رہے گا۔ مال و دولت کے حصول کے بجائے ان لوگوں کے نفس اور روح کی طرف دھیان ہو جائے گا۔ عہدے اور منصب کے بجائے سچی عزت کی تمنا ہو جائے گی۔ قابلیت کے بجائے نیکی اور طاقت اور دنیاوی اثر و رسوخ کے بجائے سچائی راست بازی اور ایمانداری کی طرف توجہ مبذول رہے گی۔

کردار کا مظاہرہ عمل اور چال چلن سے ہوتا ہے۔ اصول ایمانداری اور عقلمندی اس کے روحِ رواں اور رہبر ہوتے ہیں۔ جب کسی فرد کی قوت ارادی مذہب، اخلاق، حسنِ عمل اور غور و فکر کے زیر اثر سرگرمی سے عمل کرنے لگتی ہے تو کردار کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوتا ہے۔ ایک اعلیٰ کردار کے آدمی کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ دوسروں کا خیال رکھتا ہے۔ ظاہر اور نہایت سلامت روی سے چلتا ہے۔ اسے شہرت سے زیادہ اپنے فرائض کا خیال رہتا ہے۔ دنیا میں نام و نمود کے لیے بجائے اسے اپنے ضمیر کی آواز کا خیال رہتا ہے۔ دوسروں کی شخصیت کا احترام کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی انفرادیت اور آزادی کو بھی ہمیشہ برقرار رکھتا ہے اور اگر ایمانداری کا تقاضا ہوتا ہے تو دوسروں کی ناراضگی کی بھی وہ پرواہ نہیں کرتا، اسے یہ اطمینان ہوتا ہے کہ وقت آنے پر لوگ اس کی صداقت کا لوہا ضرور مان جائیں گے۔

کردار کی تشکیل میں یوں تو دوسروں کی مثال کا گہرا اثر پڑتا ہے لیکن خود اپنی قوت ارادی کو اس کا مرکزی ستون ہونا چاہیے۔ کیونکہ صرف اسی صورت میں انسان صحیح معنوں میں باوقار رہ سکتا ہے اور اسے انفرادی آزادی اور طاقت حاصل ہو سکتی ہے۔ ایک شاعر نے اس بات کو یوں کہا ہے کہ جب تک انسان خود اپنی ذات سے بلند نہیں ہوتا وہ بے بس اور مجبور رہتا ہے اور جب تک تھوڑی بہت عملی کارکردگی کی قوت نہ ہوگی اور اگر اس کے ساتھ قوت ارادی کی آمیزش نہ ہوگی جو کہ کردار کی جڑ اور اصل ہے اس وقت تک زندگی مبہم اور بے مقصد رہتی ہے۔

کردار کے عناصر جب معین قوت ارادی کی بدولت حرکت کرنے لگتے ہیں اور

اعلیٰ مقصد سے متاثر ہوتے ہیں تو پھر انسان نہایت ہمت و بہادری سے شاہراہ فرض پر گامزن ہو جاتا ہے اور اس پر رواں رہتا ہے۔ اسی وقت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی ہستی کی انتہائی بلندی تک پہنچ گیا ہے۔ وہ کردار کا انتہائی مظاہرہ کرتا ہے اور مردانگی کی سب سے اعلیٰ مثال بن جاتا ہے۔

اس قسم کے آدمی کے افعال اس کی ہر حرکت میں نظر آنے لگتے ہیں اس کے الفاظ میں بھی جان پڑ جاتی ہے اور وہ عملی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

اس کے برعکس طاقت کے ساتھ اگر ایمانداری اور نیکی نہ ہو تو پھر وہ بدی کا مجسمہ بن جاتی ہے۔ ایک مفکر نے لکھا ہے کہ معیاری اور اخلاقی تکمیل کی سب سے خطرناک دشمن اگر کوئی شے ہو سکتی ہے تو وہ ہے طاقت، اور خود غرضی بھی شامل کر لی جائے تو پھر انسان ایک مکمل شیطان بن سکتا ہے۔ چنانچہ اسی قسم کے لوگوں نے دنیا میں ہمیشہ انتہائی ظلم و ستم توڑے ہیں اور تباہی مچائی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ قدرت نے بھی جب کبھی اپنے مخصوص انداز میں کسی کو تباہی کے لیے منتخب کیا ہے تو اسی قماش کے آدمیوں کو۔

ایک اعلیٰ کردار کا انسان دوسروں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اس کے ارادے ہمیشہ نیک ہوتے ہیں اس کے اعمال ہمیشہ راست بازی پر مبنی ہوتے ہیں۔ اپنے فرض کی ادائیگی اس کا مسلک ہوتا ہے۔ وہ اپنے کاروبار میں ایمانداری برتتا ہے اور اپنے ہر فعل اور عمل میں دیانت دار رہتا ہے۔ اس کی گھریلو زندگی میں بھی عدل و انصاف اور سچائی نظر آتی ہے۔ اس کے قول اور فعل دونوں میں سچائی ہوتی ہے۔ وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی فیاضانہ سلوک کرتا ہے اور اپنے سے کمزور لوگوں کے ساتھ رحم دلی سے پیش آتا ہے۔

جس آدمی کا کردار اچھا ہوتا ہے۔ اس کا ضمیر ہر وقت اس کی نگرانی کرتا رہتا ہے۔ اس کے کان برابر ضمیر کی آواز پر لگے رہتے ہیں۔ ہر لفظ اور ہر فعل کے لیے ضمیر کی منظوری لازمی ہوتی ہے۔ اس کے لیے باادب ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ احترام و عزت کرنے کی صفت ایک ایسی خوبی ہے جس کی بدولت آدمی انسانیت کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ جن مقدس چیزوں کا سیکڑوں برس سے احترام ہوتا چلا آ رہا

ہے، ان کی عزت کرنا، اپنے سے بڑوں کا احترام کرنا، اچھے خیالات کا احترام کرنا، ماضی اور حال کے بڑے لوگوں کی عزت کرنا، یہ سب اعلیٰ کردار کی خصوصیات ہیں۔ انفرادی و خاندانی مسرت کے لیے بھی احترام و ادب انتہائی ضروری ہے۔ اس کے بغیر نہ انسان پر بھروسہ ہو سکتا ہے اور نہ خدا پر۔ سماجی سکون اور ترقی کے لیے بھی ادب و احترام لازمی ہے۔ یہ الفاظ دیگر تعظیم و احترام ہی مذہب کا دوسرا نام ہے کیونکہ اسی کی بدولت لوگ آپس میں متحد ہو جاتے ہیں اور سب مل کر خدا سے لو لگاتے ہیں۔

قوت ارادی ایک طاقت ہے۔ ہر اعلیٰ کردار کی روح رواں یہی شے ہے۔ جہاں یہ ہوتی ہے وہاں چہل پہل ہوتی ہے اور جہاں یہ نہیں ہوتی وہاں مجبوری مایوسی اور مردنی چھائی رہتی ہے۔

ایک اعلیٰ ظرف اور سرگرم قائد صرف اپنا ہی راستہ ہموار نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اس کے ہر فعل میں ایک اہمیت ہوتی ہے جس سے سچائی اور اعتماد ٹپکتا ہے۔ لہٰذا دوسروں کے لیے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ لاشعوری طور سے اس کا احترام کریں اور اس کے حکم پر چلیں۔

انگلستان کے مشہور وزیر اعظم گلیڈ اسٹون نے لارڈ پامرسٹن کے انتقال پر دارالعوام میں جو نذرانہ عقیدت پیش کیا تھا، اس میں کہا تھا کہ مجھے یقین ہے کہ جن باتوں کی بدولت لارڈ پامرسٹن ہم لوگوں کے لیے مشعل راہ بنے رہے ان میں سب سے زیادہ نمایاں ان کی قوت ارادی تھی۔ انہیں ہمیشہ اپنے فرائض کا احساس رہتا تھا اور وہ کبھی ہمت نہیں ہارتے تھے۔ یہ ان کی قوت ارادی ہی تھی جس کی بدولت انہوں نے ضعیفی کی کمزوریوں کے آگے بھی سر نہ جھکایا۔ بلکہ ان کو بھی زیر کر ڈالا۔ اس کے علاوہ ان میں ایک اور بھی خوبی تھی جسے یاد کر کے کسی کو بھی شرمندگی کا احساس نہ ہوگا، وہ یہ کہ لارڈ پامرسٹن کی طبیعت کچھ اس قسم کی تھی کہ انہیں کبھی طیش نہیں آتا تھا۔ اگر کبھی ناراض بھی ہوئے تو ذرا ہی دیر میں بھول گئے اور پھر شیر و شکر ہو گئے۔

غصے کے جذبات سے یہ آزادی انہیں کسی باقاعدہ تکلیف دہ محنت و مشقت کے

ذریعے نہیں حاصل ہوئی تھی بلکہ یہ ان کے دماغ کی خود ساختہ پیداوار تھی۔

جتنے بڑے رہنما ہوتے ہیں وہ اپنے ہی جیسے کردار کے لوگوں کو اپنی جانب مائل کر لیتے ہیں۔ جس طرح سے کہ مقناطیس لوہے کو اپنی طرف گھسیٹ لیتا ہے۔ جو لوگ مستعد اطوار کے حامل ہوتے ہیں ان سے دوسرے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ ایک بہادر آدمی کو دیکھ کر کمزور شخص کے دل میں بھی یہ ولولہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم بھی اس کی طرح بہادر بن جائیں۔ چنانچہ وہ اس کی تقلید کرنے لگتا ہے۔ زندگی میں اکثر ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ نیک اور عظیم ہستیاں دوسروں کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہیں اور جو لوگ ان کے حلقہ اثر میں آجاتے ہیں انہیں اپنے جیسا بنا دیتی ہیں۔

چنانچہ ان کی سرگرمیوں سے بہت سے جیتے جاگتے مرکز قائم ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں جب بھی کوئی اعلیٰ کردار کا انسان کسی اونچے منصب پر فائز ہوتا ہے تو اس کے ماتحت جو لوگ ہوتے ہیں انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان کی قوت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ بعض اوقات ذاتی کردار جادو کی طرح اثر کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کسی مافوق الفطرت طاقت کا جزو ہیں۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے عصاء سے لوگ ڈرتے تھے کہ دوسروں کی تلوار سے بھی اتنا نہیں ڈرتے تھے۔ بعض لوگوں کے نام ہی سن کر لوگوں پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ جیسے ان پر بجلی گر پڑی ہو کچھ عظیم ہستیاں ایسی بھی گزری ہیں جنہیں مرنے کے بعد کامرانی نصیب ہوئی۔

جولیس سیزر کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کا جسم جس وقت زخموں سے چور چور ہو رہا تھا اور اس کی نحیف و لاغر لاش لہولہان پڑی ہوئی تھی، اس وقت وہ بے حد ہیبت ناک اور طاقت ور معلوم ہو رہا تھا۔ کیونکہ اب وہ دنیا کی تمام باتوں سے نجات پا کر پاک وصاف ہو چکا تھا۔ تواریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ کسی بڑے آدمی کی زندگی کے حالات دراصل انسانی طاقت کی ایک لافانی یادگار ہوتے ہیں۔

آدمی مر جاتا ہے، ختم ہو جاتا ہے لیکن ان کے خیالات اور اعمال باقی رہتے ہیں اور دلوں پر نقش ہو جاتے ہیں۔ اس طور سے اس کی روح زندہ رہتی ہے اور اسے

حیاتِ جاودانی نصیب ہو جاتی ہے۔ آنے والی نسلیں اس سے متاثر ہوتی ہیں اور ان کے خیال اور عزائم اسی سانچے میں ڈھلتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے کردار بھی اسی کے مطابق سنور جاتے ہیں۔ جو لوگ صحیح راستوں پر گامزن ہو کر اعلیٰ مقام حاصل کر لیتے ہیں وہ صحیح معنوں میں انسانی ترقی کے لیے مشعلِ راہ بن جاتے ہیں۔ جس طرح سے کسی پہاڑی پر ایک چراغ روشن ہو اور اس کی روشنی چاروں طرف پھیل رہی ہو، بالکل اسی طرح اخلاقی ماحول اس قسم کے لوگوں کی بدولت منور ہو جاتا ہے او رآئندہ نسلیں اس روشنی سے فیض حاصل کرتی رہتی ہیں۔

عظیم انسانوں کی مدح و تعظیم کرنا بالکل فطری سی بات ہے۔ جس قوم سے بھی ان کا تعلق ہوتا ہے، اس کے گرد وہ ایک ہالہ ڈال دیتے ہیں اور صرف اپنے ہم عصروں ہی کو سربلند نہیں کرتے بلکہ ان کے بعد جو آنے والے ہوتے ہیں ان کو بھی سرفراز کر جاتے ہیں۔ ان کی اعلیٰ مثال ساری قوم کے لیے ایک سرمایہ بن جاتی ہے۔ ان کے عمدہ خیالات اور اعلیٰ کارنامے بنی نوع انسان کے لیے ایک شاندار میراث بن جاتے ہیں۔

یہ لوگ زمانۂ حال کو ماضی سے ملا دیتے ہیں اور مستقبل کو با مقصد بنا دیتے ہیں۔ اصول و اخلاق کا پرچم سربلند کیے ہوئے یہ لوگ انسانی کردار کی شان برقرار رکھتے ہیں اور زندگی کی تمام اعلیٰ اقدار اور روایات سے دماغ کو سیر کر دیتے ہیں۔

ایک اعلیٰ کردار جب قول اور فعل دونوں پر مشتمل ہوتا ہے تو اس کی بالکل وہی صورت ہوتی ہے جیسی کہ حیاتِ جاودانی کی۔ ایک بڑے مفکر کا خیال سینکڑوں برسوں تک لوگوں کے ذہنوں میں رہتا ہے اور آخرکار ان کی زندگی کا ایک جزو بن جاتا ہے اور وہ روزمرہ زندگی میں اس کے مطابق عمل کرنے لگتے ہیں۔ کسی خیال کا ایک عہد سے دوسرے عہد سے قائم رہنا بالکل اسی طرح کی بات ہے کہ جیسے قبر سے کوئی مردہ بولتا ہو اور ان لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کرتا ہو جن سے ہزاروں سال کی دوری ہو۔

صحیح معنوں میں تاریخ بنانے والے تو عظیم مفکر ہی ہوتے ہیں کیونکہ تاریخ فی الحقیقت نام ہے صاحب کردار لوگوں کے اس اثر کا جو بنی نوع انسان پر مسلسل ہوتا

رہتا ہے۔ بڑے بڑے رہنما، بادشاہ، درویش، فلسفی، سیاستدان اور محبان وطن جو کچھ کر جاتے ہیں وہی تاریخ بن جاتی ہے۔ دنیا کی تواریخ درحقیقت بڑے آدمیوں ہی کی تواریخ ہے۔ یہی لوگ اپنے دور کو نامزد بھی کرتے ہیں اور یہی اس میں نقش ونگار بھی بناتے ہیں۔ ان کا حلقۂ اثر بالکل ایک دودھاری تلوار کی طرح ہوتا ہے۔ یوں تو خود ان کے ذہن کی تخلیق میں بھی بہت کچھ ان ہی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ان کے انفرادی فعل سے ان کی منزل کی شناخت کی جا سکتی ہے۔

لیکن کسی قوم کی خوبیوں کا اندازہ لگانے کے لیے صرف بڑے آدمیوں ہی کو مد نظر رکھنا صحیح نہیں بلکہ اس کے بجائے اس کردار کو دیکھنا ہوگا جو اکثریت میں پایا جاتا ہے۔ محض شاندار لوگوں کے ذریعے کسی قوم کے کردار کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔ وہ تو ہر جگہ ایک ہی طرح کے نظر آئیں گے۔ سیاست دان، فلسفی اور علماء سماجی قوت مستخیلہ کی نمائندگی تو بے شک کرتے ہیں مگر عام لوگ مثلاً کارخانے کے مزدور اور کسان جن میں سے وقت ضرورت سر دھڑ کی بازی لگانے والے ملتے ہیں یہی اصل طاقت ہیں۔ اسی وجہ سے ان کو ہر قوم کی ریڑھ کی ہڈی کہا جاتا ہے۔ جس طرح سے انفرادی کردار برقرار رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح قوموں کو بھی اپنا کردار برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ آئینی حکومتوں میں ہر شخص کم وبیش حکومت میں حصہ لیتا ہے۔ لہذا ایسی حالت میں قومی کردار کا انحصار ہوتا ہے، اکثریت کی اخلاقی حالت پر۔ وہ صفات جن کی بدولت انفرادی کردار بنتا ہے انہی کی بدولت قومی کردار کا تعین ہوتا ہے۔ چنانچہ جس وقت تک اکثریت کے خیالات اچھے نہ ہوں گے وہ راست باز اور ایماندار نہ ہوں گے۔ اس وقت تک وہ دوسری قوموں کے سامنے فخر سے اپنا سر بلند نہ کر سکیں گے۔ دنیا کی دوسری قومیں انہیں حقیر ہی سمجھتی رہیں گی۔ قومی کردار کے لیے یہ لازمی ہے کہ لوگ منظم ہوں اور ادب و تعظیم کرنا جانیں۔ ان میں ضبط وتحمل ہو اور اپنے فرائض کا احساس بھی ہو اور وہ اس سلسلے میں مخلص ہوں۔ جس قوم کے دل میں صرف عیش و عشرت کا خیال قائم رہے گا وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

کوئی ادارہ خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اس سے قومی کردار کا معیار برقرار نہیں رہ سکتا۔ وہ تو لوگوں کی انفرادی قوت ارادی ہوتی ہے جس کی بدولت اخلاقی اقدار برقرار رہتا ہے اور قومی استحکام نصیب ہوتا ہے۔ حکومت بالعموم ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کہ محکوم ہوتے ہیں۔ جہاں زیادہ تر لوگ ایماندار ہوتے ہیں وہاں حکومت بھی ایمانداروں کی ہوتی ہے۔ اور جہاں بدکار، خودغرض اور بے ایمان لوگوں کی زیادتی ہوتی ہے وہاں موقع پرست، خوشامدی اور چاپلوس و بے ایمان لوگوں کا برسر اقتدار آنا لازمی ہو جاتا ہے۔ اور ان کے استحکام کا انحصار کردار کے استحکام پر ہوتا ہے۔ اگر بہت سے ناکارہ ادارے قائم ہوں تو اس سے قوم کی عظمت نہیں ہوتی۔ لوگ بظاہر تہذیب یافتہ معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر ذرا سی بھی مصیبت آ گئی تو پوری قوم کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ انفرادی کردار کی ساکھ کے بغیر صحیح معنوں میں طاقت نہیں آتی۔ دیکھنے میں لوگ امیر کبیر بھی ہوتے ہیں۔ فنون لطیفہ میں بھی گہری دلچسپی لے سکتے ہیں۔ اس کے باوجود تباہی و بربادی ان کے سروں پر منڈلاتی رہتی ہے۔ جو لوگ صرف اپنے عیش و آرام کی خاطر زندہ ہیں اس قوم کا خدا ہی حافظ ہے۔ صرف انفرادی کردار کو بلند کرنا ہی واحد علاج ہے اور اس کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ قوت ارادی کی نشوونما کی جائے کیوں کہ یہی اصل جڑ ہے۔

ہر لمحہ حیات کو آباد کیجیے

یہ کہنا کہ وقت ہی دولت ہے دراصل اس بات کی اہمیت کو کم کر دینے کے مترادف ہے۔ کیونکہ وقت ہر چیز کے لیے ایک خام مال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ وقت کا روزانہ مہیا ہو جانا بھی ایک کرامات ہے۔ ادھر صبح سو کر آپ اٹھے نہیں کہ آپ کے پاس جادو کے ذریعے آپ کی زندگی کے چوبیس گھنٹوں کا غیر تیار شدہ سامان فراہم ہو گیا۔

اب یہ بالکل آپ کا ہے، زندگی کا یہ سب سے قیمتی سرمایہ اس عدیم المثال انداز سے آپ کو ملتا ہے جیسا کہ یہ خود عدیم المثال ہے۔

وقت کے متعلق یہ چیزیں بھی ذہن میں رکھیے۔

(۱) کوئی شخص اسے آپ سے لے نہیں سکتا۔

(۲) یہ چیز چرانے کے لائق نہیں ہے۔

(۳) پھر لطف یہ ہے کہ کسی کو یہ نہ آپ سے زیادہ ملتا ہے اور نہ کم۔

(۴) خواہ کتنا ہی دولت مند آدمی ہو۔ یا ذہین و عقلمند ہو۔ اسے بھی اپنی دولت یا فہم وفراست کی بناء پر وقت کا ایک لمحہ بھی فالتو نہیں ملتا۔ یا یہ کہ اگر کوئی غریب ہے یا بے وقوف ہے تو اس کی بناء پر اس کی اس دولت میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔

(۵) اگر آپ اس قیمتی دولت کو برباد کر ڈالیں اور اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھائیں تب بھی اس کی رسد کبھی نہیں رکتی۔

چنانچہ یہ چوبیس گھنٹے آپ کو ہر روز حاصل ہیں، انہی گھنٹوں میں آپ کو اپنی صحت بنانا ہے، دولت کمانا ہے، عیش کرنا ہے، سکون وطمانیت حاصل کرنا ہے اور اپنے جسم وروح کی نشوونما کرنا ہے۔

اگر کوئی شخص اپنی آمدنی میں گزارا نہیں کر سکتا تو وہ مزید کمانے کی کوشش کرتا ہے۔ یا پھر اپنے اوپر سختی کر کے اپنی موجودہ آمدنی کے اندر تنگی وترشی سے بسر کر لیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے روزانہ چوبیس گھنٹوں سے مناسب طور پر مستفید نہیں ہو پاتا تو پھر وہ اپنی زندگی کو تباہ کر ڈالتا ہے۔

کون ہے جو زندگی میں یہ نہیں کہتا کہ "ذرا وقت ملے تو پھر میں فلاں کام میں یہ تبدیلی کر ڈالوں گا! کون ہے جس کو یہ احساس نہیں کہ وقت گزرتا چلا جا رہا ہے۔ مگر وہ اپنی زندگی کو معقول طور سے مرتب نہیں کر سکا اور ایسا امر یوں اور زیادہ افسوس ناک ہے کہ ہر شخص کے پاس ہمیشہ وقت موجود ہوتا ہے۔ مگر وہ اس کو صحیح طور پر استعمال نہیں کرتا اور اس دولت سے پوری طرح مستفید نہیں ہو پاتا۔"

زندگی ان چوبیس گھنٹوں کے اندر مرتب کرنے کے لیے پہلی ضرورت یہ ہے کہ اپنے کاموں کی دشواریوں کو ٹھنڈے دل سے سمجھا جائے اور جو کوششیں اور قربانیاں اس سلسلے میں درکار ہیں ان کو اچھی طرح سوچ لیا جائے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس فارمولے پر عمل نہیں کرتا۔ ناکامیوں پر اسے کوئی صدمہ نہیں ہوتا اور بہت کوشش کرنے کے بعد اسے معمولی سی کامیابی بھی نہیں ہوتی تو پھر اس شخص کو مزید کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ آرام سے لیٹ جانا چاہیے اور اونگھتے رہنا چاہیے۔

بات تو نہایت افسوس ناک ہے لیکن ایسے اشخاص کے لیے شاید بہتر بھی یہی ہے کیونکہ ان ہی وجوہات سے تو انسان کو اپنی قوت ارادی کو مضبوط کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں کوئی بات ٹھیک سے ہو پاتی ہے۔ انسان اور حیوان میں یہی ایک نمایاں فرق ہے۔ حیوان ہمیشہ حالات کے آگے سپر ڈال دیتا ہے لیکن انسان حالات کو اپنے حق میں موڑنے کی لگاتار کوشش کرتا رہتا ہے۔ اب قوت ارادی کی نسبت کچھ سمجھ لیجیے۔

فرض کیجیے کہ آپ یہ پوچھیں کہ میں اپنی قوت ارادی کو مضبوط کرنا چاہتا ہوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جناب والا! بس شروع ہو جائیے۔

اگر کوئی آدمی دریا کے کنارے کھڑے ہو کر آپ سے یہ پوچھے کہ بتائیے، میں کودنے کی ابتدا کیسے کروں تو آپ اسے یہی جواب دیں گے کہ میاں بس کود پڑو۔ ذرا دل کڑا کر لو اور کود پڑو۔

وقت کی مسلسل رسدی کی خاص خوبصورتی یہ ہے کہ آپ اسے پیشگی برباد نہیں کر سکتے۔ اگلا دن اور اگلا گھنٹہ اتنا ہی مکمل اور خرابیوں سے مبرا آپ کے لیے منتظر رہے گا کہ جیسے آپ نے اپنی زندگی میں ایک لمحہ بھی کبھی رائیگاں نہیں کیا۔ لہٰذا گئے ہوئے وقت پر افسوس کرنا یا اگلے ہفتے یا کل کے لیے انتظار کرنا بالکل بے سود ہے۔ بس آپ کو جو کچھ کرنا ہے اسے کر ہی ڈالیے لیکن ابتدا کرنے سے پہلے ذرا اپنے جوش سے ہوشیار رہیے گا۔ یہ جوش بڑا دھوکے باز ہوتا ہے، اس کو شروع میں مطمئن کرنا ناممکن ہے۔ اس کی خواہش تو یہی ہوتی ہے کہ ایک پہاڑ اٹھا کر پھینک دیا جاتا ہے۔ دریاؤں کا رخ موڑ دیا جائے اور جب

انسان مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوتا تو وہ اچانک تھک کر بیٹھ جاتا ہے اور مایوس ہو جاتا ہے۔
ابتدا میں بہت سی ذمے داریاں ہرگز نہ اوڑھ لیجیے۔ اتفاقات اور حادثات کے لیے کچھ جگہ چھوڑ دیجیے اسی طرح انسانی فطرت اور خاص کر اپنی طبیعت اور مزاجی کے لیے بھی کچھ گنجائش باقی رکھیے۔ اس بات کو ہمیشہ ذہن نشین رکھیے کہ کسی شاندار ناکامی سے ذرا سا بھی نقصان نہیں ہوتا مگر ایک چھوٹی سی کامیابی کی بدولت ایسی ایسی کامیابیوں کی راہیں کھل جاتی ہیں جو پہلے سے سوچی بھی نہیں جا سکتیں۔

لہٰذا دن کے چوبیس گھنٹوں کی تنگ حدود کے اندر زندگی سے لطف اندوز ہونے کے کارِ عظیم کی ابتدا کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھیے کہ شروع میں آپ کو کامیابی ہی حاصل ہو خواہ وہ کتنی چھوٹی کیوں نہ ہو۔

''ہر آدمی اپنے دن بھر کے کاروبار کے سلسلے میں سب سے بڑی غلطی جو کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وقت کے متعلق اس کا رویہ درست نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ سے اس کی دو تہائی طاقت بے اثر ہو جاتی ہے۔ بالعموم یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنے کام سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہوتا بس وہ تو وقت گزارنا چاہتا ہے، کاروبار کو بے دلی سے شروع کرتا ہے جس قدر اس میں دیر ہو سکتی ہے کرتا ہے۔ کام جس قدر جلد ختم کر سکتا ہے اسے ختم کر ڈالتا ہے اور ختم کرتے وقت خوش بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی جسمانی اور دماغی مشین پوری طرح سے کام نہیں کرتی۔''

اب آیئے ذرا ان چوبیس گھنٹوں میں کام کرنے کا جائزہ لیں۔ ممکن ہے کہ دن بھر آپ اتنا مشغول و مصروف رہتے ہوں کہ آپ کے لیے فرصت کا نام و نشان بھی نہ ہو لیکن آپ اسے ثابت نہیں کر سکیں گے۔

فرض کیجیے کہ روزی کمانے کے سلسلے میں آپ کے کم از کم سات گھنٹے صرف ہو جاتے ہیں اور سونے میں بھی سات گھنٹے چلے جاتے ہیں۔ اس میں دو گھنٹے اور ملا لیجیے اب باقی آٹھ گھنٹوں کا حساب سمجھایئے۔

ایک شخص اپنے دفتری اوقات یعنی صبح نو بجے سے شام کے پانچ بجے تک کو یہ

سمجھتا ہے کہ اس نے دن بھر کام کیا ہے۔ ان اوقات سے پیشتر جو نو گھنٹے گزر چکے ہیں اور ان کے بعد کے سات گھنٹے باقی ہیں اس کی نظروں میں ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی۔ گزشتہ نو گھنٹے گویا تمت بالخیر ہیں۔ چنانچہ اس رویے کی بدولت آدمی ان سولہ گھنٹوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں حاصل کرتا ہے تو ان کو کسی گنتی وشمار میں بھی نہیں لاتا۔ وہ ان سولہ گھنٹوں کو ایک بے کار وقت سمجھتا ہے۔ اب آپ ذرا خود ہی سوچیے کہ جو شخص اپنی زندگی کے دو تہائی حصے کو ضائع کر دے اور جس کو اس دو تہائی کو کارآمد بنانے کا کوئی ذوق وشوق نہ ہو تو پھر بھلا زندگی سے وہ کیا لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے ایک دن کو اسی دن کے اندر مرتب ومنظم کرنا ہو گا جیسے کہ ایک ڈبے کے اندر ایک دوسرا ڈبہ ہو۔ چنانچہ اس اندرونی دن کی ابتدا شام کے پانچ بجے سے شروع ہونا چاہیے اور صبح نو بجے اسے ختم ہونا چاہیے۔ ان سے سولہ گھنٹوں کے اندر آدمی بہت کچھ کر سکتا ہے، اپنے جسم اور اپنی روح کی نشوونما کر سکتا ہے، اپنے متعلقین کی فلاح وبہبود کے متعلق سوچ سکتا ہے۔ آدمی سولہ گھنٹوں میں بالکل آزاد ہے۔ وہ کسی کا ملازم نہیں ہے۔ وہ بالکل ایک رئیس کی طرح ہے جسے ملازمت یا کاروبار کی قطعی کوئی ضرورت نہیں، ان سولہ گھنٹوں کے متعلق آدمی کا یہی رویہ ہونا چاہیے اور رویہ ہی سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ زندگی کی کامیابی کا انحصار ہی اس پر ہے۔

صبح گھر سے نکلتے وقت آدمی ذرا سا بھی وقت ضائع نہیں کرتا وہ صبح سو کر اٹھتا ہے ناشتا کرتا ہے اور پھر گھر سے چل دیتا ہے۔ لیکن جیسے ہی وہ گھر سے نکلتا ہے اس کی دماغی صلاحیتیں سست پڑ جاتی ہیں۔ بس یا سواری حاصل کرنے کے لیے جب وہ کوشش کرتا ہے تو اس پر ایک دماغی بے ہوشی سی طاری رہتی ہے۔ سڑک پر پہنچ کر عام طور سے اسے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ صبح کے وقت سیکڑوں آدمی سواری حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔ اور اس طرح آدمی کا کافی وقت برباد ہو جاتا ہے۔ لوگوں کے روزانہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں گھنٹے اسی طرح تباہ وبرباد ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگ وقت ضائع ہونے کے سلسلے میں کوئی احتیاط نہیں برتتے۔

وقت ایک ٹھوس سکہ ہے۔ اس سکے کے عوض اسے کچھ نہ کچھ ضرور ملنا چاہیے۔ لیکن اگر وقت کا کوئی حصہ بھی اس طرح خرچ ہو جاتا ہے کہ اس کے عوض اسے کچھ نہیں ملتا تو یقیناً وہ آدمی خسارے میں ہے کام پر جانے کے لیے سواری کی تلاش آج کل ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جس میں آدمی کا کافی وقت برباد ہو جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس وقت کو کسی نوع بچایا نہیں جا سکتا؟

بہر حال فرض کیجیے کہ آدمی کو کسی طرح سواری مل گئی اور وہ تانگہ، رکشا یا کسی بس پر سوار ہو گیا۔ اب وہ ایک بس میں بیٹھا ہوا ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہ اس انداز سے بیٹھا ہوا ہے کہ جیسے سارا وقت اسی کا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ کسی ایسی دنیا کا آدمی ہے۔ جہاں دن بھر میں چوبیس گھنٹوں کے بجائے ایک سو چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں

اب یہ فرض کیجیے کہ وہ آدمی اپنے دفتر پہنچ گیا ہے۔ اس لیے شام کے پانچ بجے تک آپ اسے وہاں چھوڑ دیں حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ دفتر کے اوقات کے درمیان اس کو ایک گھنٹہ ملتا ہے۔ جس میں سے کچھ وقت کھانے میں صرف ہو جاتا ہے۔ باقی وقت میں وہ کچھ اور بھی کر سکتا ہے۔ اگر جی چاہے تو اس وقت میں اخبار بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

اخبار میں خود بھی بڑے شوق سے پڑھتا ہوں لیکن بلا کسی تعصب کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ اخبارات نہایت تیزی سے تیار کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا انہیں تیزی ہی سے پڑھنا چاہیے۔ روزمرہ کے پروگرام میں اخبارات کے لیے کوئی خاص وقت مقرر نہیں ہونا چاہیے۔ جو بھی فالتو وقت ملے اس میں انہیں پڑھ لینا چاہیے۔ ان کے لیے مقررہ طور پر روزانہ تیس یا چالیس منٹ صرف کرنا وقت کو فضول خرچ کرنے کے برابر ہے۔ اسی فیاضی سے وقت کے خرچ کرنے کا تو یہ مطلب ہے کہ گویا آپ بادشاہ وقت ہیں جسے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ بصد احترام مجھے یہ عرض کرنے دیجیے کہ آپ کے پاس بھی وقت کی اتنی ہی قلت ہے جتنی کہ مجھے ہے۔

اب وہ آدمی دفتر سے باہر نکلتا ہے تو تھکا ہارا نظر آتا ہے چہرہ زرد ہو رہا ہے۔ اور اگر زرد نہیں بھی ہے تب بھی اس کی بیگم یہی کہتی ہے۔ اور اس کے جواب میں وہ اپنی تھکن کا عذر

پیش کرنے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گھر پہنچتے پہنچتے وہ کافی تھکن محسوس کرنے لگتا ہے۔

گھر پہنچتے ہی وہ آدمی کھانے کے لیے بیٹھ جاتا ہے یا تقریباً ایک گھنٹے کے بعد محسوس کرتا ہے کہ ہاں اب کچھ کھانا چاہیے۔ کھانے کے بعد سگریٹ پی جاتی ہے۔ اور وہ بھی بڑی سنجیدگی کے ساتھ۔ پھر اپنے دوست احباب سے ملا جاتا ہے یا ادھر اُدھر مٹر گشتی کی جاتی ہے، کبھی تاش کی بازی جم جاتی ہے۔

کبھی کسی کتاب کے صفحات الٹ پلٹ ہونے لگتے ہیں۔ یہ لیجیے اتنے میں سوا دس بج گئے۔ سونے کا وقت ہو گیا لیکن سونے سے پہلے تقریباً چالیس منٹ تک تو صرف سونے کے بارے میں سوچا جاتا ہے۔

آخر کار دن بھر کے کام کاج سے تھک کر وہ آدمی لیٹ جاتا ہے۔ دفتر چھوڑے ہوئے اب چھ گھنٹے ہو چکے ہیں۔ اور یہ چھ گھنٹے خواب کی طرح غائب ہو گئے۔ ان کا کوئی حساب کتاب ہی نہ ہوا۔

یہ ہے آج کل لوگوں کی زندگی کا نمونہ۔ ممکن ہے کہ آپ ناراض ہو کر کہنے لگیں کہ یوں کہنے کے لیے جو چاہے اعتراض کر لیجیے۔ مگر آدمی آخر تھک بھی تو جاتا ہے اسے اپنے دوستوں سے ملنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ کوئی آدمی لگاتار ہمیشہ کام ہی کام تو نہیں کر سکتا! لیکن اگر کسی خاص جگہ جانا چاہتے ہیں تو فوراً گھر پہنچ جاتے ہیں اور تیار ہو جاتے ہیں۔ پھر چار پانچ گھنٹوں تک اپنی پسندیدہ جگہ مشغول رہتے ہیں۔ اس کے بعد سونے کے لیے چالیس منٹ تک غور نہیں کرتے۔ بلکہ فوراً سو جاتے ہیں۔ دوستوں کی ملاقاتیں اور ساری تھکن سب رفو چکر ہو جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شام نہایت طویل ہو گئی ہے یا شاید بے حد مختصر ہو گئی ہے۔

ذرا یاد کیجیے کہ طالب علمی کے دوران جب آپ نے اسکول یا کالج کے ڈرامے میں حصہ لیا تھا تو کتنی پابندی اور شوق سے آپ روزانہ دو دو تین تین گھنٹے تک ڈرامے کی ریہرسل کرتے رہتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب آدمی شام کے وقت کسی خاص بات کا بڑے ذوق شوق سے منتظر ہوتا ہے تو اس بات کی وجہ سے اس کی ساری قوت

اسی طرف مبذول ہو جاتی ہے اور محض اس خیال کی وجہ سے اس کا سارا دن انتہائی دلفریب و دلکش گزرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا دل و دماغ منور ہو گئے ہیں اور طاقت و توانائی میں خوب اضافہ ہو گیا ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر روزانہ شام کے پانچ بجے آپ صورت حال کا جائزہ لیں اور یہ یقین کریں کہ آپ تھکے ہوئے نہیں ہیں۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ آپ تھکے ہوئے نہیں ہیں۔

اور اس کے بعد اپنے اوقات کو اس طرح مرتب کریں کہ کھانے کے علاوہ درمیان میں اور کوئی رخنہ نہ پڑے۔ اس طرح آپ کو کم از کم پورے تین گھنٹے ضرور مل جائیں گے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ روزانہ تین گھنٹوں میں اپنے دماغ کو تھکاتے رہیں۔ ابتدا میں آپ ایک ایک روز کا وقفہ چھوڑ کر شام کو کم از کم ڈیڑھ گھنٹے تک کسی ایسے کام میں لگ جایا کریں جس سے آپ کے ذہن کی نشوونما ہو سکے۔

اس طرح سے آپ کو ہفتے میں تین روز پھر بھی ایسے ملیں گے کہ شام کے وقت آپ اپنے دوستوں کے ساتھ تفریح کر سکیں گے یا گھر میں اگر کوئی کام ہے تو اس کو پورا کر سکیں گے۔

اگر کچھ پڑھنا چاہتے ہیں یا کوئی مشغلہ ہے تو اسے انجام دے سکتے ہیں۔ اگر آپ نے مستقل مزاجی سے اس تجویز پر عمل کیا تو بہت جلد آپ میں یہ خواہش پیدا ہو جائے گی کہ ہفتے میں تین دن کے بجائے چار اور چار کے بجائے پانچ دن ایسے ملیں جن میں آپ شام کے وقت کسی ایسی کوشش میں لگے رہیں جس کی بدولت حقیقی معنوں میں آپ زندگی سے لطف اندوز ہو سکیں۔ پھر آپ رات کے دس بجے افتاں و خیزاں یہ بڑبڑاتے نظر نہ آئیں گے کہ چلو بھئی اب سونے کا وقت ہو گیا ہے۔ سو بھی لیا جائے۔ جو شخص بستر کی طرف رخ کرنے سے آدھے گھنٹے پہلے سونے کی تیاریاں کرتا ہے ایسے شخص کو اپنی زندگی ایک باری محسوس ہوتی ہے۔

ابتدا میں یہ ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ ہفتے میں تین روز شام کے وقت جو یہ نوے

منٹ ہیں یہ ہفتے بھر کے دس ہزار اسی منٹوں میں سب سے اہم ہیں۔ ان کی اہمیت کو بالکل اسی طور پر نظر کے سامنے رکھیے جیسے کالج یا اسکول کے زمانے میں ڈرامے کی ریہرسل کی اہمیت تھی یا اور کسی دوسری مشغولیت کی اہمیت تھی، کسی سے یہ کہنے کے بجائے کہ معاف کیجیے گا اب ذرا مجھے تاش کھیلنے جانا ہے۔ آپ کو یہ کہنا چاہیے! کہ اب مجھے کچھ کام کرنا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ طریقہ اختیار کرنا کافی مشکل ہے لیکن یہ یاد رکھیے کہ تاش کھیلنے میں اور اپنی روح کی نشوونما کرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

عام طور پر یہ پروگرام ہفتے میں صرف تین روز ہونا چاہیے یوں آپ بڑھانا چاہیں گے تو اسے بڑھا سکتے ہیں اس طرح اسے فالتو آمدنی کی طرح تصور کریں۔

اب آیئے ذرا حساب لگا کر دیکھیں کہ وقت کی بچت کے سلسلے میں ہم کتنے خود کفیل ہوئے! ہفتے میں چھ روز صبح کے وقت ایک گھنٹا اور شام کو ڈیڑھ گھنٹہ ہفتے میں صرف تین دن۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر ہفتے میں ساڑھے سات گھنٹے بچے۔

ممکن ہے، آپ یہ اعتراض کر بیٹھیں کہ جناب آپ تو ہر لمحۂ حیات کو آباد کرنے چلے تھے اور ابھی تک آپ صرف ساڑھے سات گھنٹوں کا حساب کر سکے ہیں اور وہ بھی ایک سو اڑسٹھ گھنٹوں میں سے۔ اب آپ کیا ان ساڑھے سات گھنٹوں کو لے کر کوئی جادو دکھانے والے ہیں۔ ذرا صبر کیجیے۔ میری بحث کا مطلب یہ ہے کہ اگر صرف ان ساڑھے سات گھنٹوں کو پوری طرح سے استعمال کر لیا جائے تو اس سے ہفتے بھر کی زندگی میں ایک تیزی اور روانی آ جائے گی کام کرنے اور وقت کو با مقصد صرف کرنے کا ذوق و شوق پیدا ہو جائے گا اور انتہائی اکتا دینے والے کاموں میں بھی آپ کو دلچسپی محسوس ہونے لگے گی۔

یہ خوب سمجھ لیجیے کہ وقت کے اتھاہ جنگل میں سے ساڑھے سات گھنٹوں کا نکال لانا بھی بڑا مشکل کام ہے۔ انسان کا وقت خواہ اچھی طرح صرف ہو یا بری طرح، بہرحال وہ صرف ہو ہی جاتا ہے لیکن کام کام میں فرق ہوتا ہے۔ ایک نیا کام کرنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ عادات میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ اور عادتیں بدلنا بڑا ہی کٹھن کام

ہے۔اس کے لیے کچھ قربانی دینا پڑتی ہے اور قوت ارادی کے ایک بڑے ذخیرے کی حاجت ہوتی ہے۔اسی وجہ سے دوبارہ کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں کہ اس کی ابتدا فوراً کیجیے اور بغیر کسی پس وپیش کے شروع ہو جایئے۔

ان گھنٹوں کو استعمال کرنے سے پیشتر ایک بات اور ذہن نشین کر لیجیے۔وہ یہ کہ کام کے لیے جو ڈیڑھ گھنٹہ منتخب کیا گیا ہو، اس کے علاوہ بھی وقت کی کچھ گنجائش رکھ چھوڑیے۔زندگی میں اتفاقات اور حادثات بھی پیش آتے رہتے ہیں اس کے علاوہ انسانی فطرت بھی بعض اوقات آڑے آجاتی ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ آدمی اپنے خیالات پر قابو حاصل نہیں کر سکتا۔لیکن یہ غلط ہے۔غور و فکر کی مشینری پر قابو حاصل کرنا بالکل ممکن ہے۔چونکہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ دماغ کے اندر ہی ہوتا ہے، باہر کچھ نہیں ہوتا اس لیے جو کچھ اس پراسرار دماغ کے اندر ہوتا ہے اس کی انتہائی اہمیت ہے۔ہمہ تن متوجہ ہونے کی طاقت کے بغیر یعنی کہ دماغ کو اس کی اطاعت کی پختگی کی عادت ڈالے بغیر انسان کے لیے صحیح طور پر زندہ رہنا بہت مشکل ہے اپنے دماغ پر اختیار رکھنا ایک بھرپور زندگی کے لیے پہلی شرط ہے۔چنانچہ صبح کا ایک کام جو ضرور ہونا چاہیے وہ دماغ کی چہل قدمی ہے۔زندگی کے اس اہم کام کے لیے میں نے اس وقت کو منتخب کیا ہے جب کہ آپ گھر سے دفتر کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔

شاید آپ پھر اعتراض کریں اور کہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں سڑکوں اور بسوں پر اپنے دماغ کو سنوارتا ہوں۔جی ہاں! بالکل یہی سمجھیے۔اس سے زیادہ آسان بات اور کوئی نہیں ہے۔آپ جب گھر سے باہر نکلیں تو کسی موضوع کے بارے میں غور کرنے لگیں کوئی بھی چیز ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔آپ دس قدم بھی نہ چلنے پائیں گے کہ آپ کا دماغ کسی اور بات کی طرف بھٹک جائے گا۔

آپ فوراً اسے واپس لے آیئے جس وقت تک آپ بس پر بیٹھیں گے اس وقت تک تقریباً بیس چالیس بار یہی کیفیت ہو چکی ہوگی۔اس سے مایوس نہ ہویئے۔اگر آپ مستقل مزاجی سے لگے رہے تو پھر ہرگز ناکامی نہ ہوگی۔یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب میں

جتلانہ کیجیے کہ میرا دماغ تو لگ ہی نہیں رہا۔ ذرا اس دن کو یاد کیجیے جب وہ پریشان کن خط آیا تھا۔ جس کا بہت سوچ سمجھ کر جواب دینا تھا۔ آپ کتنی مستعدی سے اس وقت تک خط کا جواب سوچتے رہے جب تک کہ آپ دفتر نہیں پہنچ گئے اور پھر دفتر پہنچتے ہی آپ فوراً اس کا جواب بھی لکھنے لگ گئے۔ بات یہ تھی کہ اس وقت حالات نے آپ کو اتنا چاق و چوبند کر دیا تھا کہ آپ ایک نہایت جابر حاکم کی طرح اپنے دماغ پر سوار ہو گئے تھے۔ آپ اس پر مصر ہو گئے تھے کہ دماغ کو اپنا کام کرنا ہوگا۔ چنانچہ اس نے اپنا کام کیا۔

لہٰذا ہمہ تن متوجہ ہونے کی مستقل مشق کے ذریعے آپ ہر لمحے اپنے دماغ پر حاوی ہو سکتے ہیں۔ مشق کرنے کے لیے صرف مستقل مزاجی کی ضرورت ہے۔ کوئی جگہ بھی ہو آپ اسے کر سکتے ہیں۔

شاید اب آپ اپنے دل میں کہہ رہے ہوں کہ یہ باتیں تو کچھ ٹھیک معلوم ہوتی ہیں لیکن یہ جو بسوں اور سڑکوں پر غور کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے، دوسرے تو شاید یہ کر سکیں مگر مجھ سے ہرگز نہیں ہو سکے گا۔ میں نہایت پرزور الفاظ میں دوبارہ کہوں گا کہ اوپر آپ کو جو باتیں بتائی گئی ہیں وہ بالکل آسان ہیں، اگر ان تجاویز کو آپ کو جو باتیں بتائی گئی ہیں اگر ان تجاویز کو آپ ٹھکراتے ہیں تو آپ نہایت نادر مشوروں کی ناقدری کرتے ہیں۔ کوشش تو کیجیے اپنے دماغ پر اختیار تو حاصل کیجیے اور پھر دیکھیے کہ زندگی کی آدھی پریشانیاں ختم ہوئی جاتی ہیں یا نہیں۔ تردد اور تشویش جیسی قابل اعتراض اور شرمناک بیماری کا قلع قمع ہوا جاتا ہے یا نہیں۔

دماغ کو ہمہ تن متوجہ کرنے کی مشق ایک ابتدائی کارروائی ہے۔ اس سرکش بیل کو جہاں اپنے قابو میں کر لیا تو پھر اس کی گردن پر جوا رکھنا بھی لازمی ہے۔ آپ کو اس کے بعد پھر کچھ اور کرنا ہوگا۔ "یہ کچھ اور" کس انداز کا ہوگا اس کے بارے میں پریشان نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ صرف اپنا ذاتی مطالعہ ہوگا یعنی اپنے آپ کو سمجھنا ہوگا۔ آج کل ایک اوسط درجے کے آدمی کی زندگی میں اگر کسی بات کی سب سے زیادہ کمی ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ سنجیدگی سے خود اپنے بارے میں غور و فکر کا عادی نہیں ہے۔ ہم لوگ اپنے بارے میں غور

نہیں کرتے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ صحیح معنوں میں جو اہم باتیں ہیں ان کے بارے میں
ہم لوگ غور نہیں کرتے، اپنی خوشی و مسرت کے بارے میں غور نہیں کرتے ہم کس سمت جا
رہے ہیں، زندگی سے ہمیں کیا حاصل ہو رہا ہے۔ ہمارے افعال و اعمال پر ہمارے فہم و
ادراک کا کتنا اثر ہو رہا ہے۔ ہمارے اصول اور ہمارے اعمال کے درمیان کیا تعلق
ہے۔ ان تمام باتوں کے بارے میں ہم غور نہیں کرتے۔ یاد رکھیے کہ مسرت و خوشی جسمانی
اور دماغی عیش و عشرت کی بدولت حاصل نہیں ہوتی بلکہ فہم و ادراک کی نشو و نما اور اصولوں و
اطوار کی ہم آہنگی سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر انسان کی اطوار مناسب طریقے سے اصولوں
سے مطابقت نہیں کرتے ہیں تو پھر وہ زندگی بالکل بے کار ہے۔ آدمی کا چال چلن اور
اصولوں کی ہم آہنگی صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ جب کہ آدمی ان کے بارے میں
روزانہ غور و فکر کرے۔ جانچ پڑتال کرے اور اپنے عزم پر مستقل مزاجی سے قائم
رہے۔ آدمی غور و فکر میں جس قدر کمی کرے گا اتنی ہی اس کی پریشانیاں بڑھتی جائیں گی۔

اگر آپ کسی ہوٹل کے خدمت گار پر اس وجہ سے ناراض ہوتے ہیں کہ اس نے جلا
ہوا گوشت لا کر آپ کے سامنے رکھ دیا ہے تو فوری طور پر غصہ کرنے کے بجائے ذرا اپنی فہم و
ادراک سے کام لیجیے اس طرح آپ کی سمجھ میں آ جائے گا کہ اس خدمت گار نے وہ گوشت
نہیں پکایا ہے۔ لہٰذا گوشت کے جلنے کے سلسلے میں اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی اور
بالفرض اگر ذمے داری اسی کی تھی تب بھی غصہ ہو کر آپ کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ آپ نے
صرف اپنی طبیعت مکدر کر لی اور اپنی شکل بگاڑ لی اور خدمت گار کو بھی بدتمیز اور منہ زور بنا دیا
اور ان تمام باتوں کے باوجود گوشت اسی طرح جلا رہا۔ اس کی حالت تبدیل نہ ہو سکی۔

عقل سے مشورہ کرنے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آئندہ اگر کسی دوسرے ہوٹل میں جلا بھنا
گوشت آپ کے سامنے آ گیا تو آپ خدمت گار کو بے خطا سمجھتے ہوئے خاموشی سے
پلیٹ کو اپنے سامنے سے سرکا دیں گے اور کسی دوسری چیز کا آرڈر دے دیں گے۔ اس
طرح آپ کا وقار بھی بڑھے گا اور کسی قسم کا نقصان بھی نہ ہو گا۔

اصولوں کی تشکیل میں اور اطوار کی مشق میں کتابوں سے بہت مدد مل سکتی ہے۔

لیکن یہ یاد رکھیے کہ خود اپنا ذاتی تجزیہ کرنا ایمانداری سے اپنے اعمال و افعال پر نظر ڈالنا اور جو کچھ آپ آئندہ کرنے والے ہیں اس پر غور و فکر کرنا دنیا بھر کی کتابوں کے مطالعہ سے کہیں افضل و بہتر ہے۔

اپنا ذاتی تجزیہ کرنے کا کام کس وقت کرنا چاہیے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شام کو جس وقت آپ دفتر سے واپس آئیں اس وقت ان باتوں پر اگر غور کرلیا جائے تو مناسب ہے جب آدمی محنت و مشقت کرتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ غور و فکر کرنے کی طرف راغب ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت اگر غور و فکر کے بجائے آپ اخبار پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں تو بھی کوئی مضائقہ نہیں، ویسے جتنی دیر میں کھانا لگایا جائے اتنی دیر میں اگر آپ اخبار پڑھ لیں تو کیا مضائقہ ہے۔ بہرحال دن و رات میں کسی نہ کسی وقت اپنے بارے میں غور و فکر کرنا نہایت ضروری ہے۔ اب آیئے شام کے اوقات کا جائزہ لیں۔

بہت سے لوگ شام کا وقت بالکل بے کار کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس کا ہی کا اگر کوئی نعم البدل ہے تو وہ علمی کتابوں کا مطالعہ ہے اور اتفاق سے ان لوگوں کو علم و ادب سے کوئی ذوق نہیں ہوتا۔ یہ بڑی غلطی ہے۔ علم و ادب کے علاوہ بھی بہت سی معلوماتی کتابیں ہیں جن سے مختلف پیشے والوں کو فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے مشاغل ہیں جن سے انسان لطف اندوز ہوسکتا ہے مثلاً موسیقی وغیرہ۔ اسی طرح مصوری اور دیگر فنون لطیفہ سے بھی فیض حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے آپ کہیں کہ مجھے تو فنون لطیفہ سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن اگر آپ غور کریں گے تو کسی نہ کسی چیز میں آپ کو ضرور دلچسپی ہوگی۔

فن اپنی جگہ پر ایک نہایت عظیم شے ہے۔ لیکن یہ عظیم ترین شے ہرگز نہیں۔ زیادہ اہم بات ہے سبب اور انجام کی، ادراک و احساس کی۔ جب کسی شخص کی گھڑی چوری ہو جاتی ہے تو اس کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ چور اپنے ماحول اور وراثت کے اثرات کی وجہ سے چور بن گیا ہوگا۔ یہ بات دلچسپ بھی ہے اور سمجھ میں بھی آتی ہے۔ چنانچہ وہ آدمی خوشی سے نہیں تو مجبوراً دوسری گھڑی خرید لیتا ہے جس کی بدولت

اس کے دل میں تلخی باقی نہیں رہتی۔ سبب اور انجام کے مطالعہ سے آدمی ان چیزوں کی طرف سے چشم پوشی اختیار کر لیتا ہے جن کی بدولت بہت سے لوگ زندگی کی بھول بھلیوں میں حیران و پریشان رہتے ہیں۔

ہر بات کے سبب اور انجام کا مطالعہ کرنے سے زندگی کی تکالیف کم ہو جاتی ہیں اور اس کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ جس شخص نے ارتقا کا صرف نام سنا ہے اور اس کے بارے میں اور کچھ نہیں جانتا وہ سمندر کو محض پانی کا ایک ذخیرہ ہی سمجھتا ہے۔ لیکن جس شخص کے خیال میں سبب اور انجام کا تصور ہوگا اسے سمندر پہلے بھاپ کی شکل میں نظر آئے گا پھر وہ کھولتا ہوا پانی دکھائی دے گا اور اس کے بعد وہ اسے برف کی شکل میں منجمد محسوس ہوگا۔ انسان کو کسی بات سے اتنا اطمینان و سکون حاصل نہیں ہوتا جتنا کہ زندگی کی دلفریبیوں اور رنگینیوں کے احساس سے ہوتا ہے۔

فرض کیجیے کہ آپ کسی ایسے ادارے میں ملازم ہیں جہاں جائداد غیر منقولہ کی خرید و فروخت کی جاتی ہے اور آپ کو اس کام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ اپنے جسم کو زندہ رکھنے کے لیے یہ کام کرنے پر مجبور ہیں ایسی صورت میں سب سے پہلی بات یہ سمجھ لیجیے کہ دنیا میں کوئی بات اکتا دینے والی نہیں ہے زندگی کی رنگیاں اور تبدیلیاں انتہائی دلفریب اور دل کش ہوتی ہیں۔ چنانچہ آپ کے اس کام کے سلسلے میں بھی دلفریبی اور رنگینی موجود ہے بشرطیکہ آپ اس پر غور کریں۔ کراچی کی مضافاتی بستی کو لیجیے پہلے یہ تمام جگہیں ویران پڑی ہوئی تھیں جیسے کہ اب بھی بعض جگہ ویران پڑی ہوئی ہیں مگر آبادی کے ساتھ ساتھ نئی نئی بستیاں آباد ہونے لگی ہیں۔ مکانات تعمیر ہونے لگے اور اب یہ کیفیت ہے کہ دور دراز مقامات پر بھی مکانات کا ایک لامتناہی سلسلہ موجود ہے عمارتوں کی قیمتیں بڑھی ہوئی ہیں۔ کرایہ بھی دن بدن بڑھتا جا رہا ہے کیا یہ سب باتیں بالکل بے کیف ہیں؟ اب اگر آپ املاک و جائیداد کی تجارت کو اس پس منظر سے دیکھیں اور غور کریں تو کیا اس سے آپ کو اپنے کام میں ایک نئی دلچسپی محسوس نہ ہوگی۔ اور اس کی بدولت آپ کی زندگی میں ایک تبدیلی نہ پیدا

ہو جائے گی۔ ہفتے میں شام کو تین بار اگر آپ اس مسئلے پر اس طور سے غور کریں تو یقیناً آپ کا اپنے کام میں جی لگنے لگے گا۔

اسی طرح فرض کیجیے کہ کسی بینک میں ملازم ہیں۔ اب اگر آپ ایسی چند کتابوں کا مطالعہ کریں جن میں بنک کے پس منظر کے بارے میں کوئی دلچسپ رومانی افسانہ پیش کیا گیا ہو تو شام کے نوے منٹ بے حد دلچسپ بن جائیں گے اس کی بدولت آپ انسانی فطرت کو بہتر سمجھنے لگیں گے اور آپ کو بینک کے کام سے بھی ایک دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔

زندگی سے بھرپور لطف اٹھانے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ علم و ادب ہی کے دلدادہ اور شائق ہوں یا فنون لطیفہ سے آپ کو دلچسپی ہو، روزمرہ کے کسی کام میں بھی اگر آپ تجسس و شوق اور تحقیق پیدا کر لیں تو پھر دیکھئے کہ زندگی کس طرح گل و گلزار بن جاتی ہے۔ تسلی و اطمینان کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا دل فہم و ادراک سے معمور و منور ہو، ایسے لوگوں کی دنیا میں کوئی کمی نہیں ہے۔ جنہیں مطالعہ کا کچھ شوق ہے ایسے لوگوں کو اپنے مطالعہ سے فائدہ اٹھانے کے لیے کچھ باتیں بتائی جاتی ہیں۔

ناولوں کو سنجیدہ اور متین مطالعہ کی صف سے ہمیشہ علیحدہ رکھنا چاہیے۔ یعنی ہفتے میں تین بار نوے منٹ کا وقت اگر مطالعہ کے لیے مخصوص کر لیا جائے تو اس میں ناول کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ خراب ناولوں کو تو خیر پڑھنا ہی نہیں چاہیے، اب رہے اچھے ناول تو ان کے پڑھنے میں بھی ذہن کو کوئی خاص کاوش محنت کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔ ناول پڑھنے والا دریا میں ایک تنکے کی طرح بہتا چلا جاتا ہے اور کنارے پر پہنچ جاتا ہے۔ یوں وہ کچھ بے دم تو بے شک ہو جاتا ہے مگر تھک کر نڈھال نہیں ہوتا۔ تمام عمدہ ناولوں کے پڑھنے میں تکان محسوس نہیں ہوتی لیکن دماغ کی نشوونما کے لیے اور طبیعت میں ذوق و شوق پیدا کرنے کے لیے سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ تکان کا احساس ہو۔ کوئی مشکل محسوس ہو یعنی کام ایسا ہو جس کو ایک طرف تو آپ پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتے ہیں مگر دوسری طرف دل یہ بھی کہتا ہے کہ اگر اس سے جان بچ جائے تو بڑا اچھا ہو اور ناول پڑھنے میں ایسا احساس نہیں ہوتا۔

جملہ اقسام ادب میں شاید تخیلی شاعری ہی ایک ایسی چیز ہے جس میں سب سے زیادہ تکان محسوس ہوتی ہے کیونکہ یہ ادب کی اعلیٰ ترین شکل ہے، یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر لوگ اس شاعری کو نہیں پڑھتے اگر شعر و شاعری سے آپ کو دلچسپی ہے تو پھر آپ ان ادیبوں کے مضامین و کتابیں پڑھیں جنہوں نے شاعری کے بارے میں اصول بنائے ہیں تاکہ آپ کو معلوم ہو سکے کہ دراصل شاعری کیا چیز ہے۔ اگر آپ نے اس قسم کی کتابیں پڑھ لیں تو پھر آپ کو خود یہ شوق پیدا ہو جائے گا کہ آپ خود بھی اشعار کہہ سکیں۔

لیکن اگر آپ شاعری کے خلاف ہی ہیں تو آپ کے لیے تواریخ یا فلسفہ موجود ہے۔ شاید یہ بات آپ کو مشکل معلوم ہو مگر آپ یقین کریں ایک معمولی قابلیت و ذہانت والا آدمی بھی اگر ایک سال تک مسلسل پڑھتا رہے تو پھر تواریخ یا فلسفہ ادبی کتابوں پر بھی وہ عبور حاصل کر سکتا ہے۔

مطالعہ کے ذریعے ذاتی اصلاح و ترقی کی دو صورتیں نہایت عمدہ ہیں۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ اپنی کوشش کی سمت اور وسعت کا پہلے اندازہ کر لیں اور پھر ایک مناسب وقت منتخب کر لیں یا کوئی خاص موضوع یا کوئی خاص مصنف پسند کر لیں یا اپنے دل میں یہ طے کر لیں کہ میں فلاں چیز یا فلاح واقعہ کے متعلق معلومات حاصل کروں گا۔ پھر اپنے مخصوص وقت پر اپنے منتخب کردہ موضوع پر لگ جایئے کسی بات پر ماہر خصوصی ہونا بے حد اچھا معلوم ہوتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ پڑھتے وقت غور بھی کرتے رہیے۔ بہت سے لوگ پڑھتے تو بہت ہیں مگر اس سے ان کو کوئی فیض نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ صرف پڑھتے ہی رہتے ہیں اور ذہن نشین کچھ نہیں کرتے کتابوں کے حصول کے لیے وہ ادھر اُدھر گھومتے رہتے ہیں، ان کا خاص مقصد صرف حرکت ہوتی ہے وہ صرف اسی بات پر فخر کرنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے سال بھر میں اتنی کتابیں پڑھ کر ختم کر ڈالیں۔

جس وقت تک آپ مطالعہ کے دوران خوب غور و فکر نہ کریں گے اس وقت تک آپ کے پڑھنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس کے لیے آپ کو آہستہ پڑھنا پڑے گا۔

اس سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے منزل کو بھول جائیے۔ صرف اردگرد کے مناظر کو دیکھتے رہیے۔ کچھ عرصے بعد جب کہ شاید آپ کو اس کا گمان بھی نہ ہوگا ایک آپ منزل تک پہنچ جائیں گے۔ وقت کے سلسلے میں ان تجاویز کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے آپ کو وہ خطرات بھی بتا دینا ضروری ہیں جو بعض انسانوں کی راہ میں حائل ہو جایا کرتے ہیں۔ سب سے پہلا خطرہ تو یہ ہے کہ آدمی خود پسند بن جایا کرتا ہے۔ خود پسند انسان ایک ایسا احمق ہوتا ہے جو بڑے تزک و احتشام سے چہل قدمی کے لیے نکلتا ہے اور اپنے لباس کا ایک اہم حصہ گنوا بیٹھتا ہے۔ ایک خود پسند آدمی دوسروں کے لیے وبال ہو جاتا ہے۔ اس پر اگر کسی بات کا انکشاف ہوتا ہے تو وہ اس سے اتنا زیادہ متاثر ہوتا ہے کہ پھر وہ ساری دنیا سے محض اس لیے بیزار رہنے لگتا ہے کہ یہ لوگ آخر میری طرح متاثر کیوں نہیں ہوتے۔ لہٰذا جب آپ اپنے وقت کو استعمال کرنے کا پروگرام بنائیں تو یہ یاد رکھیں کہ یہ وقت صرف آپ کا ہے، کسی دوسرے کا نہیں لہٰذا اپنے کو خود پسند بننے نہ دیں۔

دوسرا خطرہ یہ ہے کہ لوگ بعض اوقات اس طرح سے اپنے پروگرام کے غلام بن جاتے ہیں کہ پھر انہیں کسی اور بات کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ یہ لوگ خود اپنی زندگی کو ایک وبال بنا لیتے ہیں اور اپنے اعزاء اور احباب کے لیے بھی مصیبت بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ پروگرام تو خیر اپنی جگہ پر ہے مگر اس کی پرستش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ایک اور خطرہ ہوتا ہے بھاگ دوڑ کا۔ یعنی ہر وقت اس بات کا خیال دل پر مسلط رہنے لگتا ہے جو کچھ دیر بعد کرنی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اپنے پروگرام کو از سرِ نو مرتب کیا جائے اور تکمیل کی بہت زیادہ کوشش نہ کی جائے۔ ایک بہترین صورت یہ بھی ہے کہ ایک کام کرنے کے بعد جان بوجھ کر تھوڑا توقف کیا جائے، بہ الفاظ دیگر جان بوجھ کر پانچ منٹ کا وقت ضائع کر دیا جائے۔

اور سب سے بڑا خطرہ وہی ہے جس کا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے، یعنی کوشش یہ

ہو کہ ابتدا میں ناکامی ہرگز نہ ہونے پائے کیونکہ اس سے شروع ہی میں انسان کی ہمت پست ہو جاتی ہے اور یہ کامیابی اگر تھوڑی ہو تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

قدم آہستہ ہی اٹھیں تو کوئی حرج نہیں مگر تسلسل برابر قائم رہے۔ جب کسی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا فیصلہ کرلیں تو ہر طرح کی بددلی اور مشکلات کے باوجود اسے ختم ہی کر دیں۔ جب کوئی کٹھن کام پورا ہو جاتا ہے تو اس سے خود اعتمادی میں بڑا اضافہ ہو جاتا ہے۔

آخر میں یہ یاد رکھیے کہ شام کے وقت جو مشغلہ بھی آپ منتخب کریں، اس میں اپنے ذوق اور اپنی طبیعت کے رجحان کو ضرور مدنظر رکھیں۔ فلسفہ اپنی جگہ پر نہایت عمدہ چیز ہے اور فلسفی بننا بھی نہایت اچھا ہے لیکن اگر آپ کو فلسفے سے رغبت نہیں اور اس کے بجائے سڑکوں کے غل غپاڑے سے زیادہ دلچسپی ہے۔ تو پھر فلسفہ چھوڑ دیجیے اور غل غپاڑے ہی کی طرف لگ جائیے۔

آپ اپنی عزت کیجیے

پرانا مقولہ ہے اور اس کی سچائی میں شک بھی نہیں کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی عزت کی جائے تو پہلے دوسروں کی عزت کریں مگر یہاں ایک دوسرا اور بظاہر اس سے مختلف مشورہ ہے۔ اور وہ یہ کہ آپ خود اپنی عزت کریں۔ اگر چاہتے ہیں کہ آپ کی عزت کی جائے۔ یہ نفسیات کا ایک مسلمہ اصول ہے۔ جس کا جائزہ ہر دو پہلوؤں سے لیا جانا چاہیے۔ ایک یہ کہ ہم دوسروں کی عزت کر ہی نہیں سکتے اگر ہم اپنی عزت نہیں کرتے۔ اس لیے کہ یہ ایک رویہ ہے جو سیکھنا اور اختیار کرنا پڑتا ہے اور سیکھنے کا عمل اپنی ذات سے ہی شروع ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ بالفرض اگر ہم دوسروں کی عزت کریں

بھی تو کیا دوسرے محض اس لیے ہماری عزت کرنے لگیں گے کہ ہم ان کی عزت کرتے ہیں؟ عزت کسی کاروبار یا کسی لین دین کا نام نہیں۔ یہ کسی شے کے بدلے میں نہیں بلکہ فرد یا قوم کے کردار کے سبب فریق مقابل کرنے پر مجبور ہوتا ہے بہتر ہوگا اگر ایک بار پھر ایک سرسری نظر اس پر ڈال لی جائے۔

اگرچہ سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ اپنی عزت سے مراد کیا ہے۔ معاشرے کی اقدار، تہذیبی و تاریخی روایات، مذہبی حدود و ترجیحات اور آفاقی سچائیاں، ان سب کے امتزاج سے کسی قوم کے افراد اور فرد کا مزاج و کردار بنتا ہے۔ دوسری قوموں کے درمیان یہی مزاج و کردار اس قوم اور اس کے افراد کی شناخت ہوتا ہے اور ذریعہ عز و افتخار بھی۔ اس قوم کے افراد آپس میں اسی معیار پر ایک دوسرے کو پرکھتے ہیں اور اسی حوالے سے ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں، ان سے محبت کرتے ہیں اور ان کو دوست رکھتے ہیں۔ یہاں تک بات سیدھی سادی ہے۔ پیچیدگی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب سوال خود اپنی ذات یا اپنے آپ کا ہو۔ گفتگو کو مختصر کرنے کی خاطر ہم کینوس کو چھوٹا کر لیتے ہیں اور پاکستان اور پاکستانی قوم تک رہتے ہیں۔ دور حاضر میں پاکستانی معاشرہ جس طرح ہمہ رخ انحطاط میں مبتلا ہے، دوسرے بہت سے اسباب کے علاوہ مثلاً سیاسی جبر، معاشی عدم مساوات، معاشرتی اذکار رفتہ واقدار وغیرہ کے سبب ہم من حیث القوم عزت نفس سے ناواقف اپنی محبت سے تہی دامن اور اپنی دوستی سے محروم ہیں یہ ہمارا انفرادی المیہ بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ وضاحت کی ضرورت نہیں کہ ہماری اقدار، روایات، مذہبی تقاضے اور وہ آفاقی سچائیاں جن پر ہم ایمان رکھتے ہیں، کیا ہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ مستثنیات کو چھوڑ کر کیا ہم جزوی طور پر بھی ان پر عمل پیرا ہیں؟ نہیں ہیں! تو خرابی کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے کہ دوسروں کو تو ہم دھوکا دے سکتے ہیں۔ اپنے آپ کو نہیں۔ اگر ہم جھوٹ، رشوت، ہوس وزر، اقرباء پروری، خودغرضی، عصبیت وغیرہ کو برا کہتے نہیں تھکتے۔ اگر ہم سچائی، بے غرضی، علم دوستی، انسان دوستی وغیرہ کا پرچار کرتے ہیں لیکن ان پر عمل پیرا نہیں ہیں تو اس رویہ سے جو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ اس کی

زد میں سب سے پہلے ہم خود اور پھر سارا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔

انسانی ذہن کی صلاحیت اور خصوصیت یہ ہے کہ بار بار کوئی بات دہرائی جائے اور بتائی جائے خواہ اس بات میں کوئی حقیقت نہ بھی ہو تب بھی وہ اس پر یقین کر لیتا ہے۔ انسانی ذہن کی اسی خصوصیت کے پیش نظر اشیائے صرف کے اشتہار بار بار دکھائے اور دہرائے جاتے ہیں۔ یہاں تو صورت یہ ہے کہ جن اعلیٰ قدروں اور سچائیوں پر بہت زور دیا جا رہا ہے۔ ہمارا ذہن اور دوسرے لفظوں میں خود ہم پہلے ہی ان پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ مسلسل تکرار سے اس ایمان میں مسلسل شدت اور پختگی پیدا ہوتی ہے۔ اب اگر ہمارا عمل ہمارے دعوے کی ضد ہو جو کہ ہے تو خود ہماری نظروں میں ہمارا وقار گر جاتا ہے۔ ہمارے ضمیر کی عدالت ہمیں مجرم قرار دیتی ہے۔ قول و عمل کا یہ ٹکراؤ اضطراری یا اتفاقاً ہو تو احساس جرم و ظلم ہمیں اس کی تلافی پر مجبور کر دیتا ہے اور تلافی کے بعد ہمارا اطمینانِ قلب اور اعتمادِ ذات عود کر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ ٹکراؤ مسلسل ہو تب ہمارا ضمیر ہمیں عادی مجرم سمجھ کر ہم سے مایوس ہو جاتا ہے۔ ہماری نظروں میں ہمارا احترام ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ کیونکہ ہمارے معاشرے بلکہ پوری انسانی برادری میں مجرم کا احترام اور عزت کرنے کی کوئی روایت موجود نہیں۔ اپنی تئیں مجرم یا منافق یا بدکردار ہونے کے سبب اپنے وجود کو ملک و ملت کے لیے ناکارہ بلکہ نقصان دہ جان کر ہمارے اندر گہری مایوسی، احساس جرم، خود رحمی یا خود آزادی وغیرہ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کیفیت کو چھپانے کے لیے ہم اپنے آپ سے اور دوسروں سے شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے تئیں زیادہ بلند و بانگ دعوے کرتے ہیں۔

مذہب اور اخلاقی قدروں پر بظاہر یہ شدت عمل پیدا ہوتے ہیں لیکن افسوس کہ یہ طریقۂ کار ہمارے اندر احترام اور اعتمادِ ذات بحال کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ نتیجتاً ہم خود ترسی کے ساتھ ساتھ حسد اور مردم آزادی کی کیفیت میں مبتلا ہوتے جاتے ہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ ہم برے ہیں تو دوسرا اچھا کیوں ہے۔ خود آزادی اور مردم آزادی، اذیت کوشی اور اذیت پسندی کی یہ کیفیت اگر اس کے سدباب کے لیے

کچھ نہ کیا جائے تو تسلسل بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اگر یہ کیفیت انفرادی نہ ہو، اجتماعی ہو تو پورا معاشرہ مریض ہو جاتا ہے۔

موجودہ پاکستانی معاشرہ اس کیفیت کی ایک مکمل مثال ہے۔ دہشت گردی، قتل، اغوا، آبرو ریزی، بموں کے دھماکے اور ان میں تواتر اور تسلسل۔ یہاں انسان نہ صرف انسان کا دشمن نظر آتا ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایذا رسانی اور دہشت گردی اس کے لیے لذت کوشی اور تسکین نفس کا ذریعہ بن چکی ہے۔ ایسے میں کیوں کر ممکن ہے کہ دوسروں کی یا اپنی عزت کی جائے اور اگر نہیں تو کیا محض تماشائی بن کر دیکھتے رہا جائے۔ یہاں تک کہ یہ قوم مٹ جائے اور یہ ملک خدانخواستہ دنیا کے نقشے سے غائب ہو جائے کہ تاریخ عالم قوموں کے ہمہ رخ انحطاط کو اسی نقطۂ اختتام تک پہنچاتی ہے۔

سو اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا ملک قائم و دائم رہے، اقوام عالم میں ہماری ایک باعزت شناخت ہو، انفرادی اور اجتماعی طور پر ہم ایک دوسرے سے محبت کریں اور ایک دوسرے کو دوست رکھیں تو اس کے لیے ہمیں فی الفور عمل شروع کر دینا چاہیے کہ عمل کے بغیر کوئی خواہش، کوئی بھی خیال، خواہ وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو، کسی بھی طرح کے نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ اور عمل کی ابتدا ہمیں اپنے آپ سے ہی کرنی پڑے گی۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ جن سماجی، معاشرتی، مذہبی روایات و اقدار کو ہم قابل فخر جانتے ہیں اور جن کا ڈھنڈورا پیٹتے نہیں تھکتے، کیا ہم ان پر عمل پیرا بھی ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو کیوں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وقت اور حالات کی تبدیلی کے سبب ان میں سے بیشتر یا بعض قابل عمل نہیں رہ گئیں؟

اگر یوں محسوس ہو خرابی کی ابتدا یہی ہے اور اصلاح یہیں سے شروع ہونی چاہیے۔ چیزوں اور حالات و واقعات کو جذباتی نہیں منطقی نقطۂ نظر سے دیکھیے۔ دوسری قوموں اور افراد سے اپنا موازنہ اور مقابلہ کیجیے۔ تمام مذہبی، لسانی اور علاقائی تعصبات سے الگ رہ کر اپنا احترام کرنے سے پہلے اپنے آپ سے دوستی کیجیے۔ گہری، سچی، پائیدار دوستی۔ اپنی کمزوریوں کو اپنے آپ سے بیان کرتے نہ

شرمائیے۔ گناہوں اور کمزوریوں پر خود کو لعن طعن نہ کیجیے۔ یاد رکھیے کہ انسان نہ مجسم خیر ہے نہ مجسم شر۔ احساس جرم پیدا نہ ہونے دیجیے۔ نہ کسی نادان دوست کی مانند اپنی کمزوریوں کا جواز اور سبب ڈھونڈ نکالیے یا انہیں معمولی جان کر ان پر توجہ دینے سے ہی انکار کر دیجیے۔ نہ ان کو دوسروں کے سر تھوپیے۔ بیہ کہ ایک دانا اور رازدار دوست کی طرح اپنے بارے میں اپنے آپ سے مکالمہ کیجیے۔ اپنی ساری فطری کمزوریاں اور اپنی ساری جبلی خوبیاں خود سے بیان کیجیے۔ ہمدردانہ دوستی سے اپنے آپ کو غور سے سنیے۔ اپنی کمزوریوں سے ایک ایک کرکے پیچھا چھڑائیے۔ اپنی خوبیوں میں قدم قدم اضافہ کرتے جائیے۔ ابتدا بہت چھوٹی چھوٹی خرابیوں سے کریں۔ ان کو ترک کر کے آپ میں اعتماد ذات پیدا ہوگا۔ ابتدا میں چھوٹی چھوٹی نیکیاں کریں۔ ان سے آپ میں احترام ذات پیدا ہوگا۔ ہر شب اپنا غیر جانبدارانہ جائزہ لیں۔ مایوس نہ ہوں۔ جو کام آج نہ ہو سکا عہد کریں کہ کل ضرور کریں گے۔ یاد رکھیے کہ ایسے بڑے عہد ابتدا میں نہ کریں کہ جو پورے نہ کر سکیں۔ ابتدا میں یہ عہد صرف چند گھنٹوں کے لیے بھی کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر غصہ آپ کی کمزوری ہے تو عہد کیجیے کہ کل طلوع آفتاب تک غصہ نہیں کریں گے۔ صبح اٹھ کر اس عہد کو پھر دہرائیے یقین کے ساتھ۔ دن میں غصہ آئے تو یاد رکھیے کہ آپ نے آج غصہ نہ کرنے کا عہد کیا ہوا ہے۔ بے شک کل غصہ کر لیجیے گا۔ آپ کی کامیابی آپ میں حوصلہ اور یقین پیدا کرے گی۔ یہ یقین آپ کی کایا پلٹ کر رکھ دے گا۔ ہر شب اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کا جائزہ لیں۔ علم پروری، انسان دوستی، وسیع القلبی، خدمت وایثار وغیرہ ایک ایک گھونٹ کر کے اپنے اندر اتارتے رہیے۔ ہر صبح عہد کیجیے کہ ایک نیکی ضرور کریں گے۔ کسی چھوٹی سی نیکی سے ابتدا کریں۔ مثلاً کسی نابینا کو سڑک پار کرانا، کسی پریشان حال کی پریشانیوں کا احوال سن لینا اور اس کی دل جوئی کرنا۔ رفتہ رفتہ بڑی نیکیاں مثلاً ہسپتال جا کر کسی لاوارث مریض کی خبر گیری، کسی غریب بچے کو پڑھنے میں مدد دینا۔ آپ نیکی کرنا چاہیں تو ہمارے ملک میں غور کرنے کی ضرورت نہیں کہ کیا کیا

جائے۔ یہاں خلق خدا مبتلائے بلا ہے۔ آپ اکیلے کام کریں۔ اپنے دوستوں کو اپنے کام میں شامل کریں۔ تنظیم بنا کر بڑے پیمانے پر رفاہی کام کریں۔ جتنا وقت آپ حصول معاش اور گھریلو ذمہ داریوں سے بچا سکیں، معاشرے کے مفاد میں خرچ کریں، رزق حرام سے اجتناب کریں، رزق حرام، چور بازاری، رشوت یا اسمگلنگ ہی نہیں، یہ بھی ہے کہ آپ اپنے پیشے کے فرائض سے پہلوتہی کریں۔

مثلاً اگر آپ استاد ہیں تو بچوں کو گیس پیپر یا رٹنے کی عادت ڈال کر ان کے جاننے اور سیکھنے کی صلاحیت کو نقصان نہ پہنچائیں۔ ابتدا میں ذکر ہوا تھا کہ جن روایات و اقدار پر ہم عمل پیرا نہیں، لیکن عمل پیرا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، ایسا تو نہیں کہ وقت اور حالات کی تبدیلی کے سبب ان میں سے بعض قابل عمل نہ رہ گئی ہوں۔ اگر ایسا ہے تو ہمت و حوصلہ کر کے ان سے انکار کیجیے ان کو نا قابل عمل بنائیے۔ اغلب ہے کہ آپ کا انکار دوسروں میں بھی جرأت پیدا کرے گا۔ امکان ہے کہ اس طرح ان روایات و اقدار کا از سر نو جائزہ لیا جائے گا، اور اگر یوں نہ بھی ہو تو کم از کم آپ کا ضمیر تو مطمئن ہو گا کہ آپ جو نہیں کر سکتے، اس کے کرنے کا دعویٰ بھی نہیں کرتے۔ اس طرح آپ کی نظروں میں آپ کا وقار بڑھے گا۔ آپ معاشرے سے کم از کم ایک کم اچھے شخص کو کم کر دیں گے۔ کیا یہ بڑا کام نہیں؟ حالانکہ امکان غالب یہی ہے کہ آپ کا رویہ آپ سے متعلق لوگوں میں بھی عمل نیک کا رجحان پیدا کرے گا۔ یوں باہم احترام اور عزت کا رویہ جنم لے گا۔

ایک آخری بات یہ کہ آپ کی ذات کا بھی آپ پر حق ہے۔ اپنی خوشیوں کا سامان کیجیے۔ سیر و سیاحت کو جائیے۔ دوستوں سے گپیں ہانکیے۔ خوش رہیے۔ دوسروں کو خوش رکھیے۔ اس سے آپ کی توانائی، ہمت، خوش دلی اور اس کے نتیجے میں زندگی میں اضافہ ہو گا۔ سکون پذیر ہونے اور مراقبہ کی تکنیک سیکھیے۔ ہر صبح اور ہر شام مراقبہ کیجیے۔ پرسکون رہیے اور اپنے ذہن کو اپنے تابع رکھیے اور پھر دیکھیے کہ آپ کی زندگی میں کیا انقلاب عظیم آتا ہے۔ لوگ کس طرح آپ کی عزت اور آپ سے محبت کرتے ہیں۔ یاد رکھیے زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔ اس سے اپنا حق وصول کیجیے اور اس کا حق

اسے دے دیجیے اور پھر اس دنیا کو دیکھیے۔

بقول حالی

جو کہتے ہیں یہ کہ جہنم ہے دنیا
وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

آپ کے بہترین دوست

ہم اپنے جذبات کا اظہار مختلف اوقات میں مختلف انداز سے کرتے ہیں جو خود ہم پر اور دوسروں پر مختلف اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ثمینہ جو فطرتاً بے حد پر جوش واقع ہوئی ہے، ایسے جذبات کے اظہار سے اکتا جاتی ہے جو زندہ دلی سے عاری ہو۔ عارف، ٹیلی فون پر سنائی دینے والے "ہیلو" کے انداز سے مخاطب کے جذبات اور احساسات کا اندازہ کر لیتا ہے۔ امجد کی آواز فٹ بال کا میچ دیکھتے ہوئے اس قدر پر جوش ہو جاتی ہے کہ کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دیتی، جب کہ پریشان کن حالات میں سائرہ کے بے جان الفاظ "اف یہ سب کیا ہے" اس کی جذباتی کیفیت کا پہلا مکمل اظہار ہوتے ہیں۔
بے عملی کا احساس ہمیں پر جوش عمل کے لیے اکساتا ہے۔ ہم فوراً کسی لمبی ڈرائیو پر نکل کھڑے ہونا چاہتے ہیں یا دیر تک فون پر بات کرتے رہتے ہیں۔ میں نے اور میرے دوستوں نے خوشی اور غم کے مختلف لمحات میں ایک دوسرے کو سہارا اور تسلی دی ہے، خواہ ان حالات کا تعلق بیماری، حادثہ، بیروزگاری، طلاق، بیرون ملک روزگار کی تلاش یا محبوب کی ستم ظریفیوں، عشق میں ناکامی اور ہمسفر کی تلاش سے ہی کیوں نہ رہا ہو حوصلہ بڑھانے اور تسلی دینے کی یہ دوستانہ پیش کش ایک ایسا عمل ہے جو ہماری رفاقتوں اور محبتوں کو دوچند کرنے اور انہیں قائم رکھنے کا سبب بنتا ہے۔ حالات سے نمٹنے کی یہ ایک ایسی حکمت عملی ہے جو نہایت موثر ثابت ہوتی ہے۔ یہ شاید مبالغہ نہ ہوگا

اگر میں یہ کہوں کہ عنایتوں کا یہ سلسلہ ہماری بقاء کے لیے بے حد ضروری ہے۔

ہم انسان ہیں کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد نے خوراک اور اپنی صلاحیتوں کو ایک مقررہ فرض کے طور پر آپس میں تقسیم کرنا سیکھا تھا۔ یہ الفاظ ایک مغربی مفکر رچرڈ لیکی نے لکھے ہیں۔ ہمارے خانہ بدوش اجداد جو خوراک اور پناہ کی تلاش میں مسلسل سرگرداں رہتے تھے۔ اجنبی قبیلوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کے پاس صرف دو ہی مواقع ہوتے تھے۔ یا تو وہ دوسرے کے اسباب اور وسائل کو بہ زور ہتھیالیں یا پھر محاذ آرائی سے بچنے کی خاطر آپس میں تحائف کا تبادلہ کریں تحفوں کی قبولیت ان کی دوستی کی بنیاد بن جایا کرتی تھی۔

قدیم انسان کے نزدیک تحفتاً دی جانے والی شے تحفہ دینے والے کے روحانی جوہر سے زندہ جاوید ہوتی تھی۔ اس لیے تحفہ قبول کرنے والے کی جانب سے تبادلے میں ایسے ہی کسی قیمتی تحفے کی پیش کش نہ کرنا اخلاقی اصولوں کو توڑنے اور قبیلے پر بدنامی کا داغ لگانے کا باعث سمجھا جاتا۔ فیاضی کے بدلے فیاضی حاصل کرنے کا یقین ایسی مشترکہ کوششوں کی حوصلہ افزائی کرتا تھا اور مختلف قبائل کو آپس کے جھگڑوں سے بھی محفوظ رکھتا تھا۔ وہ اپنی لوٹ مار اور مال غنیمت کو آپس میں بانٹا کرتے، اپنی معلومات کا تبادلہ کرتے اور اس طرح ایک مستحکم اور مضبوط معاشرے کو جنم دیتے۔

موجودہ دور میں مال کے بدلے مال کے نظام کی جگہ ایک اور غیر اشیائی نظام نے لے لی ہے۔ اب ہم جب پانچ یا دس روپے کی ڈبل روٹی یا بسکٹ وغیرہ خریدتے ہیں تو کبھی بھی یہ محسوس نہیں کرتے کہ ہم نے کسی روحانی یا اخلاقی اصول کی خلاف ورزی کی ہے۔

تحفوں کے تبادلے کی قدیم روایت سے ملتی جلتی روایت اب صرف اہم تقریبات میں دوستوں کے درمیان تحائف کے تبادلے کی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے دور میں فیاضانہ اقدامات کے لیے مادی اشیاء کے بجائے جذبات اور احساسات کے سکے استعمال کیے جاتے ہیں احساسات کے اس لین دین میں کچھ لوگ نہایت سخی ہوتے ہیں، کچھ بے حد کنجوس اور چند ایک ایسے بھی جو اپنے بجٹ کی حدود کے اندر رہتے ہیں۔

سیٹھ قاسم ایک مثالی مالدار گھرانے میں سونے کا چمچہ منہ میں لیے پیدا ہوا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ وراثت میں ان کو اس قدر مال و متاع حاصل ہوگا جو ان کی معاشی خود مختاری کا ضامن ہوگا۔ انہوں نے اپنا سرمایہ اسٹیٹ ایجنسی کے ایک منفعت بخش کاروبار میں بدل دیا۔ سیٹھ قاسم کے پاس اب بے پناہ سرمایہ ہے اور شاید کچھ لوگوں کے نزدیک ان کے پاس اسی قدر ذہنی سکون بھی ہوگا کہ وہ مادی اور جذباتی دونوں معاملات میں فیاضی کا مظاہرہ کر سکیں۔ لیکن ان کے دوست ان کے بارے میں بالکل مختلف رائے رکھتے ہیں۔

قاسم کے کالج کا دوست کہتا ہے۔ "میرے خیال سے قاسم کی دولت اسے لوگوں سے میل ملاقات بڑھانے سے روکتی ہے۔ وہ خود کو ایک امیر گھرانے کا ایک ایسا بچہ سمجھتا ہے۔ جسے کوئی بھی سنجیدگی سے نہیں لیتا۔ اس لیے عیش و آرام کی زندگی گزارنے کے باوجود دوستوں کی موجودگی میں اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی دولت کا کم سے کم مظاہرہ کرے اور ہوٹل کے بل کی ادائیگی میں پہل نہ کرے، ٹپ دینے میں کنجوسی دکھائے اور کوشش کرے کہ ٹیکسی کا کرایہ ہم سب ادا کریں۔ یوں مجھے لگتا ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ ہی قلاشی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

قاسم علی کو علم ہے کہ لوگ اسے ضرورت سے زیادہ کنجوس ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ وہ ان الزامات پر نہایت اعلیٰ ظرفی اور سنجیدگی کے ساتھ بحث و مباحثہ کرنے کو ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میرے والد نے ہمیشہ مجھے اس بات کی تنبیہ کی ہے کہ میں دوسروں کو اپنی ذات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دوں۔

اگر وہ بھی محسوس کرتے کہ میں دوستوں کے ساتھ دعوتوں میں شاہ خرچی کا مرتکب ہوا ہوں یا میں نے دوستوں کو ان کے گھر تک پہنچانے کے لیے ڈرائیور اور گاڑی استعمال کی ہے تو مجھے ایک طویل ناصحانہ لیکچر دیا کرتے، اور کبھی اگر کسی کو اتفاق سے چند روپے بطور ادھار دے دیتا تو ان کا ردعمل کچھ یوں ہوتا جیسے میں نے خاندان کی تمام جائداد اپنے باورچی کے حوالے کر دی ہو۔ اس لیے جب بھی میں ہوٹل کا بل ادا کرنے

کے لیے پہل کرنا چاہتا ہوں تو مجھے اپنے باپ کا سر انکار میں ہلتا ہوا دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں پورا بل ادا کرنے کے بجائے اسے آپس میں مساوی تقسیم کرنے پر ترجیح دیتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں یہ ان دوستوں کے خلاف میرا دفاعی اقدام ہے جو میری وجہ سے نہیں بلکہ میری دولت کی وجہ سے دوستی رکھنا چاہتے ہیں۔

انتہائی مادی مصلحتوں کے ماحول میں تربیت یافتہ ہونے کے باعث آپ اپنے تمام تر اثاثے حتیٰ کہ احساسات اور جذبات کو بھی ایک ختم ہو جانے والی پونجی سمجھنے لگتے ہیں۔ جیسا کہ عمرانیات کے ایک ماہر نے کہا ہے۔ ''ہم اپنے دماغ بھی کھاتے رہتے ہیں جس میں ممنونیت، محبت، غصہ جرم اور تمام دوسرے جذبات کی آمدنی اور اخراجات کا حساب رکھتے ہیں۔'' ابلاغ کی کمی اور غلط فہمی کے سبب بھی کبھار اس بارے میں نہایت اختلافی تصورات جنم لیتے ہیں کہ دوسروں کے لیے کس قسم کے جذبات اور احساسات رکھنے چاہئیں۔

ایک اور کنجوس شخص کے دوست نے بھی احساسات پر دولت کے اثرات کے بارے میں ایسے یہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ''احمد دوستی اور محبت کو اپنی اعلیٰ اختیاراتی تاجرانہ ذہنیت سے پرکھتا ہے۔ کم سے کم خرچ کے بدلے زیادہ سے زیادہ وصول کرو۔'' قاسم کی پرورش بھی کچھ اسی طرح ہوئی ہے۔ لیکن کنجوس بنانے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔

آمنہ اپنے والدین کی حد سے زیادہ ناز برداریوں کا شکار رہی ہے۔ ہر کامیابی پر اس کی بے حد تعریف کی جاتی۔ جب کہ ناکامیوں کی ذمہ داری دوسروں کی کوتاہ بینی لاپروائی اور حسد پر ڈال دی جاتی۔ ایسی بے جا ناز برداریاں کسی بھی فرد کے فیاضانہ رویے کو سختی سے کچل سکتی ہیں۔ والدین کی ناز برداریوں کو مثال بنانے کے بجائے آمنہ کے ذہن میں یہ بات گھر کر گئی کہ اس کی ضروریات دوسروں کی ضروریات پر مقدم ہیں اور یہ کہ دوسروں کی محبت کا امتحان اس بات میں ہے کہ وہ اس کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کس قدر مستعد ہیں۔ ''آمنہ کی کسی بات کا جواب نفی میں دینا بے حد مشکل ہے۔'' اس کی دوست کہتی ہے۔ ''کیونکہ انکار کی صورت میں وہ رونے لگتی

ہے اور عدم تحفظ کے احساس سے دوچار ہو جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے جب امتحانات کے دوران اس نے مجھ سے نوٹس طلب کیے تو ظاہر ہے ان دنوں خود مجھے ان نوٹس کی بے حد ضرورت تھی اس لیے میں نے زور دیا کہ وہ نوٹس لے جانے کے بجائے میرے ساتھ ہی بیٹھ کر مطالعہ کر لے۔ میرے اس جواب پر اس کا ردعمل کچھ ایسا تھا جیسے وہ اپنی بہترین سہیلی سے ہاتھ دھو بیٹھی ہو اور میں سمجھتی ہوں، اس کی سوچ کے مطابق وہ کسی حد تک درست بھی تھی کیونکہ اس کی درخواست کا رد کیا جانا، خواہ وہ کتنی ہی نامعقول کیوں نہ ہو، ایسا تھا جیسے آپ اسے مکمل طور پر رد کر رہے ہوں۔ نتیجتاً مجھے اپنے نوٹس اسے دینے پڑے۔ لیکن جب میں نے اس سے ایک کتاب طلب کی تو اس نے عجیب بہانوں سے ٹال مٹول شروع کر دی۔

آمنہ کی ایک اور سہیلی شکوہ کرتی ہے کہ آمنہ خود پرستی سے کبھی بھی جان نہیں چھڑا سکتی! اگر آمنہ کے لباس میں درزی سے کوئی خامی رہ جائے تو گھنٹوں یہ موضوع زیر بحث رہے گا اور وہ اس بات سے قطعی لاتعلق رہے گی کہ آپ کسی مصیبت کا شکار ہیں۔ اگر آپ کی جیب کٹ جائے یا پرس کھو جائے تو اس سے پہلے کہ وہ آپ کو دس کا نوٹ ادھار دے۔ وہ چاہے گی کہ آپ پہلے اسے کسی ایسے درزی کا پتا بتائیں جو اس کے لباس کی خامی دور کر سکے۔

آمنہ کی دونوں سہیلیاں اس بات کا اقرار کرتی ہیں کہ وہ احساس ندامت یا فخریہ جذبات میں نہایت تیزی سے دوستوں پر عنایتوں اور محبتوں کی بھرمار کر دیتی ہے۔ اس کی یہ فیاضی اس کے دوستوں کے بجائے خود اس کے اپنے موڈ اور مزاج کی مناسبت سے ہوتی ہے۔ وہ اپنی ان سخاوتوں کو اس وقت ایک موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ جب دوست اس پر خود غرض ہونے کے الزامات عائد کرتی ہیں۔

فیاضیوں اور مہربانیوں کا ایسا چابکدستانہ استعمال ہمارے ہاں عام ہے۔ لوگ آپ پر اس وقت تک فیاضانہ دعوتوں کی بھرمار کرتے رہتے ہیں، پھول نچھاور کرتے رہتے ہیں اور داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے رہتے ہیں جب تک کہ آپ سے ان کا

کام نہیں نکل جاتا۔ افسران اپنی بدمزاجی اور سخت لب ولہجہ کو نرم اور دوستانہ لہجے میں تبدیل کر لیتے ہیں جب انہیں کسی اہم کام یا پروجیکٹ کے سلسلے میں آپ کی بھرپور معاونت کی ضرورت ہوتی ہے۔ فیاضی کا یہ جعلی رویہ اس سے فیض یاب ہونے والوں کی خوشی میں اضافے کے لیے نہیں بلکہ محض ان سے تعاون حاصل کرنے کے لیے برتا جاتا ہے۔

آزادی اور خود مختاری جیسا کہ ہر بچے کو سکھایا جاتا ہے، زندہ رہنے اور خوشیاں حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ سیاسی نظریہ آہستہ آہستہ انفرادیت پسندی میں تبدیل ہوتا رہا ہے۔ ہم محض اپنی ذات کے سہارے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ ہم تحفہ دینے والے یا مہربانی کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کرتے وہ ہاتھ جو ہماری کفالت یا مدد کرنا چاہتا ہے اس بات سے خوفزدہ ہے کہ اسی ہاتھ کو کہیں کوئی کاٹ نہ کھائے۔ ماہر عمرانیات فلپ سلیٹر اپنی کتاب دی پرسوٹ آف لونلی نس میں لکھتے ہیں کہ امریکہ میں آزادی کی تربیت تقریباً پیدائش کے وقت سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ امریکی بچہ دوسرے ممالک کے بچوں کے مقابلے میں اپنے والدین کی آغوش میں بہت کم رہتا ہے۔ اور وہ اپنا زیادہ تر وقت اکیلے گزارتا ہے۔ جیسے ہی بچہ الفاظ ادا کرنے کے قابل ہوا، اسے بڑا آدمی یا عورت، ہونے کا احساس دلایا جانے لگتا ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اسے اپنے طور پر کھیلنا کودنا اور اپنے معاملات کو خود نمٹاتا ہے۔

انفرادیت پر بے انتہا زور ایک ایسے رجحان کو جنم دے سکتا ہے جو کسی کی مہربانی اور عنایت حاصل کرنے سے گھبراہٹ پر مشتمل ہو۔ یہ رویہ ایسے لوگوں کو جنم دے سکتا ہے جو دوستوں، خاندان والوں اور ساتھیوں کی ہمدردیوں سے خود کو محفوظ رکھنا پسند کرتے ہوں۔ نفسیات کے ایک ماہر کا کہنا ہے کہ ایسے نوجوان جو کسی سے مدد یا تعاون کی درخواست نہیں کرتے، وہ دراصل بچپن میں والدین کی جانب سے فوجی دستے کے کمانڈر بننے پر اکسائے گئے ہوتے ہیں جن کی مدد کی درخواست کو ان کے والدین نے ٹھکرا دیا ہوتا ہے اور انہیں وقت سے پہلے بڑوں جیسی ذمہ داریاں قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہوتا ہے۔ نتیجتاً وہ نوجوانی میں بھی کسی سے مدد طلب کرنے سے اس لیے خوفزدہ

رہتے ہیں کہ کہیں کوئی انہیں ناموزوں اور نااہل قرار نہ دے دے۔ یہاں تک کہ وہ دوسروں کو اپنی محبتیں واپس لے لینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ کچھ لوگ دوسروں کی ہمدردی اور تعاون حاصل کرنے سے اس لیے بھی گریزاں رہتے ہیں کہ اس قسم کی عنائتیں انہیں دوسروں کا مقروض بنا دیتی ہیں جو ان کی آزادی میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہیں۔

لوگ اپنی خود مختاری کی دیوانگی کا نہایت بے ضرر مظاہرہ روزانہ کرتے رہتے ہیں۔ آپ اکثر کسی جگہ کی تلاش میں گھنٹوں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں لیکن کسی سے پتا دریافت کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔ آپ کسی دکاندار سے دوسرے دکاندار کا پتا معلوم کرنے سے احتراز کرتے ہیں اور نتیجتاً اسی تگ ودو میں کئی گھنٹے برباد کر دیتے ہیں۔ دفتری کاموں میں زیادتی کے باوجود لوگ اپنے ساتھیوں سے مدد طلب نہیں کرتے اور اعصابی دباؤ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات دوسروں پر اعتماد نہ کرنے کا یہ رویہ ذاتی نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ آپ کا دوست اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے لیکن وہ اپنے ایسے دوست سے رابطہ قائم کرنے سے ہچکچاتا ہے جو اپنے وسیع تعلقات کے باعث ایسے حالات میں اس کی مدد کر سکتا ہے۔ آپ کو ہر وقت یہ خوف ستاتا رہتا ہے کہ تھوڑی سی مدد کے بدلے مجھے دس گنا زیادہ ادا کرنا پڑے گا۔

دوستی کے لیے بڑھائے جانے والے ہر ہاتھ کو شک وشبہے کی نظر سے دیکھنا دراصل امید افزا اور پیشہ وارانہ کامیابی کے مواقع کو گنوانے کے مترادف ہے۔ کاروبار اور زندگی میں کامیابی کا دارومدار کسی تجربہ کار کی نصیحتوں اپنے ہم پیشہ لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے اور باہمی مفادات پر مبنی دلچسپیوں میں حصہ لینے پر ہوتا ہے۔ اسی طرح دوستی ختم کرنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کی محبتیں اور ہمدردیاں حاصل کرنے کی ضرورت کو یکسر نظر انداز کریں۔

سائرہ ایک اشتہاری کمپنی میں آرٹسٹ ہے اور اپنی معاشی خودمختاری پر بے حد فخر ہی نہیں کرتی بلکہ اسے ایک نہایت پرکشش اور تخلیقی صفت بھی سمجھتی ہے۔ تمام کام خود کرنے کے اصول پر کاربند ہونے کے باعث وہ اپنے فلیٹ کا روغن بھی خود کرنے کی

اہل ہے۔ حتی کہ شام کا کھانا بھی اکیلے ہی کھانا پسند کرتی ہے۔ ان کی شادی شدہ زندگی بھی ایسے ہی اکیلے پن کا شکار ہے۔ وہ اپنے کام کی خاطر تفریحی پروگرام کو پس پشت ڈال دیتی ہے۔ جب کہ اس کا شوہر تفریح پسند اور زندگی سے لطف اٹھانے کا قائل ہے۔ اس کے شوہر کے مطابق سائرہ نہ صرف محنتی اور جفاکش ہے بلکہ گھریلو معاملات میں بھی اس کی دلچسپی اور توجہ قابل تعریف ہے۔ لیکن ایک خامی یا خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے مسائل اور ذمہ داریوں میں کسی کو شریک نہیں کرتی اور تمام بوجھ اور مسائل کو تن تنہا اٹھانے پر ترجیح دیتی ہے۔ سائرہ کی ایک اچھی سہیلی جہاں اس کی خود مختاری اور خود اعتمادی پر رشک کرتی ہے وہاں اس کی اس خاموش اور پرسکون طبیعت پر بھی حیران ہوتی ہے جس کا وہ نہایت مستقل مزاجی سے مظاہرہ کرتی ہے۔ سائرہ اکثر اپنی سہیلی سے کہتی ہے! میں تمہیں اپنے چھوٹے مسائل سے اکتا دینا نہیں چاہتی۔ آج کل مجھے اپنے کام میں کچھ دشواریوں کا سامنا ہے۔ خیر تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کل تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔

سائرہ کی سہیلی جمیلہ اعتراف کرتی ہے! مجھے ماننا پڑے گا کہ سائرہ کی سہیلی ہونا بھی کڑی آزمائش ہے وہ نہایت مہربان اور دوسرں کے لیے قربانی دینے والی عورت ہے لیکن اپنے معاملات میں اس کا کسی سے ایک لفظ بھی نہ کہنا مجھے کبھی کبھی ہذیانی کیفیت کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ سائرہ کی اپنے مسائل کے بارے میں کم گوئی اس کی سہیلی کے لیے اس وقت تک ایک غیر اہم مسئلہ رہی جب تک کہ سائرہ ایک مشکل ترین مسئلے سے دوچار نہ ہو گئی۔

جمیلہ دو ہفتے تک سائرہ سے ملاقات کے لیے سرگرداں رہی لیکن وہ کبھی گھر پر نہ ہوتی تو کبھی دفتر میں بھی نہ ملتی۔ بہرحال جیسے ہی اس کی ملاقات ہوئی تو سائرہ کا چہرہ دیکھتے ہی جمیلہ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی بے حد سنجیدہ مسئلے سے دوچار ہے۔ اس کا وزن تقریباً 10 پاؤنڈ کم ہو چکا تھا، چہرہ ستا ہوا اور زردی مائل ہو رہا تھا اور اس کی شوخی بھی کہیں گم ہو چکی تھی۔ سائرہ نے اس کی وجہ اسے کام کی زیادتی بتائی۔

کچھ دیر گفتگو کے بعد سائرہ کی آنکھیں بھر آئیں تو جمیلہ نے اس کی پریشانی کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مسلسل ٹالتی رہی۔ آخر کار جمیلہ نے جب واضح طور پر سائرہ کو بتادیا کہ وہ اس وقت تک سوالات کرتی رہے گی۔ جب تک کہ وہ اس کی پریشانیوں کا سبب معلوم نہ کرلے تو وہ اس کی پریشانیوں کا سبب نہ معلوم کرلے بالآخر سائرہ یکدم پھوٹ پڑی۔ اس کا شوہر کافی عرصے سے کسی دوسری عورت میں دلچسپی لے رہا تھا اور اس نے چپکے سے دوسری شادی کرلی تھی۔ سائرہ کے لیے یہ خبر بے حد چونکا دینے والی اور ناقابل قبول تھی۔ اس نے ایک ماہ ہوا اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کرلی تھی اور اب سوچ رہی تھی کہ جیسے ہی کچھ حالات بہتر ہوں، وہ جمیلہ کو تمام حقائق سے باخبر کردے گی۔

سائرہ کی یہ خواہش کہ وہ مجھے اپنے دکھوں میں شریک نہ کرے میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ ''جمیلہ نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم برسوں سے ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ دوستی کے اس تمام عرصے میں سائرہ نے ایک بار بھی مجھ سے کسی مدد یا تعاون کی درخواست نہیں کی تھی۔ نتیجتاً میں نے سائرہ سے کہہ دیا کہ اگر وہ مجھے اپنا دوست نہ سمجھ سکتی تو میں بھی اسے اپنا دوست نہ سمجھنے پر مجبور ہوں گی۔ اس کے بعد اپنے کئی معاملات میں مجھ سے کھلنے لگی۔ لیکن اب بھی وہ اپنی زندگی کے بیشتر پہلو مجھ سے خفیہ رکھنے کی چھوٹی چھوٹی کوشش کرتی رہتی ہے جس کی وجہ سے میں اکثر اس سے ناراض ہو جاتی ہوں۔ کبھی کبھی اس بات پر مجھے اپنے آپ پر بھی غصہ آتا ہے کہ میں اس کی زندگی کے بارے میں مکمل طور پر کیوں نہیں جانتی۔

دوستی اور تعلقات میں اکثر محسن اور احسان مند کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک اپنی اپنی باری پر بیمار اور مسیحا کا کردار ادا کرتا ہے۔ جب ہم کسی کے آنسو دیکھتے ہیں تو فوراً صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ جب ہم کسی کو محبوب کی بے وفائی کے باعث اپنی شوخی گنواتے دیکھتے ہیں تو مسخرے بن جاتے ہیں۔ جب کوئی حسین چہرہ یکا یک خود کو بدصورت سمجھنے کے واہمے کا شکار ہو جاتا ہے تو ہم ایسا آئینہ بن

جاتے ہیں جو اسے خود اعتمادی فراہم کرتا ہے۔

لوگوں سے مدد اور ہمدردی کا طلب گار نہ ہونا بھی کنجوسی کا ایسا مظاہرہ ہے جیسا کہ ضرورت مند کی مدد سے انکار کرنا۔ یہ ایک ایسے ان کہے معاہدے کی خلاف ورزی ہے جو دوستوں کے درمیان طے پاتا ہے۔ اگر ہمارے دوست ہمیں ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے محروم رکھتے ہیں تو نتیجتاً ہم بھی انہیں ایسی ذمہ داریوں کا پابند کرنے سے ہچکچائیں گے۔ اس طرح ہمیں ان لوگوں کے دکھوں کا مداوا کرنے کے موقع سے محروم کر دیا جاتا ہے جنہیں ہم پسند کرتے ہیں اور ہمیں ان کے درد اور تکلیف کا خاموش تماشائی بننے پر مجبور کر دیا جاتا ہے جب کہ ہم انہیں اس سے نجات دلانے کے لیے اپنی خدمات پیش کر سکتے تھے۔

خاموش تماشائیوں کے لیے ایک جواں سال ٹیچر نجمہ کا کردار مثالی بن سکتا ہے۔ وہ ہر وقت اپنے دوستوں کی مدد کے لیے تیار رہتی ہے۔ کسی کو نزلہ بھی ہو جائے، وہ بھاگتی ہوئی اس کے گھر پہنچ جائے گی اور اپنی خدمات فراہم کرنے کو تیار ہوگی۔ اس کی خدمتوں کا سلسلہ مختصر حلقے تک ہی محدود نہیں ہے۔ جب اس کی ایک سہیلی اپنے کام کی مصروفیت کی وجہ سے اپنے بیمار بچے کی صحیح دیکھ بھال سے محروم تھی تو نجمہ فوراً اس کی مدد کو پہنچ گئی۔ اس نے ہفتہ بھر کے لیے اسکول سے چھٹی لے لی اور بچے کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئی۔ وہ اسے ہسپتال دکھانے لے جاتی، وقت پر دوا پلاتی، اس کے لیے کھانا بناتی اور ضرورت پڑتی تو اس کے گندے کپڑے تک دھو دیا کرتی۔ نجمہ کی سہیلیوں کے پاس اس کی ان ہمدردیوں اور دوسروں کے لیے خدمت گزاری کے اس رویے کے بارے میں سوائے مذاق کرنے کے اور کچھ بھی نہیں جہاں کسی کو کوئی مسئلہ یا پریشانی درپیش ہوتی ہے تو دوست احباب مذاق کے طور پر مشورہ دیتے ہیں کہ وہ خادم خلق نجمہ سے رجوع کرے۔ لیکن کبھی کبھار اس کی سہیلیاں نجمہ کی زندگی کے اس پہلو پر بھی گفتگو کرتی ہیں جس کا وہ شکار رہی ہے۔ نجمہ کی ایک قریبی سہیلی بتاتی ہے کہ اس کی توجہ اور مہربانیاں اسے اپنی حد سے زیادہ شفیق اور مہربان ماں کی یاد دلاتی ہیں۔ سہیلیاں اس سے چھوٹے سے چھوٹے مسئلے کا ذکر کرنے سے بھی کتراتی ہیں کیونکہ وہ فوراً ہی ان کی جانب متوجہ ہو

جاتی ہے اور وقت سے پہلے ایک ایسی ناگہانی مصیبت کا احساس دلا دیتی ہے جس کا
ابھی دور دور تک کہیں نام ونشان بھی نہیں ہوتا ہے۔

خدمت خلق کا یہ انتہا پسندانہ جذبہ اکثر ایسے دوستوں کو اس سے دور کر دیتا ہے
جنہیں وہ خود سے بے حد قریب رکھنا چاہتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کا یہ ردعمل خود اس
کی اپنی ذات کی بہتری اور ترقی میں رکاوٹ کا سبب بنتا ہے۔

خود کو دوسروں کے لیے وقف کرنے کا یہ انتہائی جذبہ عموماً عورتوں میں مردوں
کے مقابلے میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ نفسیات دانوں کے مطابق لڑکیاں ابتدا ہی سے
خود کو ماں کی شکل میں دیکھتی ہیں جب کہ لڑکے خود کو ماں سے علیحدہ محسوس کرتے
ہیں۔ اسی لیے لڑکے جب بڑے ہو کر مرد بن جاتے ہیں تو کسی کی زیادہ قربت انہیں
اپنا تشخص کھو دینے کے خوف سے دوچار کر دیتی ہے۔ جیسا کہ نجمہ کی عادتوں سے ظاہر
ہوتا ہے ایسے لوگ اس غلط عقیدے کو اپنا لیتے ہیں کہ اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے
تگ ودو کرنا خود غرضی بن جاتا ہے۔

صرف اپنی ذات تک محدود رہنا یا ہر لمحے دوسروں کے لیے اپنے آپ کو وقف
کرنے کے لیے تیار رکھنا، دو انتہائیں ہیں جن سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

خود مختار ہونے اور دوسروں پر انحصار کرنے کے علاوہ ایک اور صورت بھی ہوتی ہے۔
جسے باہمی انحصار بھی کہتے ہیں۔ جب ہم کسی کو کچھ دیتے ہیں تو اپنے آپ کو مضبوط اور مستحکم
کرتے ہیں۔ جب دوسروں کی مدد حاصل کرتے ہیں تو اپنی ذات کی افزائش کرتے ہیں
اور ہم سب ایک ایسی کشتی کے سوار ہیں جو ایک دوسرے پر انحصار پر مائل بہ سفر ہے۔

منفرد شخصیت

اربوں انسانوں میں سے کوئی سے بھی دو افراد ایسے نہیں جو عادات واطوار اور شکل وصورت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مماثل ہوں، اسی لیے ماہرین یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ہر فرد ایک منفرد شخصیت رکھتا ہے۔

ہر انسان قدرت کا ایک شاہکار ہے۔ دنیا میں اربوں انسان آباد ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے کسی قدر مختلف ہیں۔ اس کے بارے میں ماہرین نفسیات یا ماہرین حیاتیات سے پوچھیے۔ اربوں انسانوں میں کوئی سے بھی دو افراد ایسے نہیں ہیں جو عادات واطوار اور شکل وصورت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مماثل ہوں۔ بایوکیمسٹری کے ایک امریکی پروفیسر راجر جے ولیمز کا کہنا ہے کہ بایوکیمسٹری پر تجربات کے دوران مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ دوا کے بارے میں ہر شخص کا ردعمل دوسرے سے مختلف ہے۔ میں قائل ہو گیا کہ ہم میں سے ہر شخص منفرد شخصیت کا مالک ہے۔ اور یوں لگتا ہے کہ قدرت نے اسے خاص طور پر تخلیق کیا ہو اور یہ خصوصیات ہی انسانی شخصیات کی بنیاد ہیں۔ یہ بات ہر ایک کو معلوم ہے کہ ہر انسان کی انگلیوں کے نشانات مختلف ہوتے ہیں اور ہر شخص کے جسم سے ایک مخصوص بُو نکلتی ہے جسے سونگھ کر کتے اس شخص کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ انسانوں کے درمیان پائی جانے والی یہ تفریق ایسی ہے جسے ہر شخص دیکھ سکتا ہے اگر آپ انسان کے اندر کی دنیا پر غور کریں تو بہت سے حیرت انگیز انکشافات ہوں گے۔

مثال کے طور پر انسانی معدے کو لیجیے۔ ہر شخص کا معدہ سائز اور شکل کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے اور بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ معدہ سائز میں اتنا ہی مختلف ہوتا ہے، جتنی ہماری ناک یا منہ۔ ان کے افعال اور کارکردگی میں بھی فرق ہوتا ہے یہی وجہ

ہے کہ ہر شخص کھانا ہضم کرنے میں مختلف وقت لیتا ہے۔ حال ہی میں امریکہ میں پانچ ہزار افراد پر مشتمل ایک سروے کیا گیا۔ یہ لوگ صحت مند تھے۔ انہیں معدے کی کوئی بیماری لاحق نہیں تھی۔ اس کے باوجود انہیں کھانا ہضم کرنے میں جو وقت لگا، وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف تھا۔ ہائیڈ ریولک ایسڈ کھانے کو ہضم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ عنصر ہر شخص میں مختلف مقدار میں پایا جاتا ہے۔ اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن میں یہ عنصر سرے سے پایا ہی نہیں جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص ایک ہی مقدار میں کھانا نہیں کھاتا اور اس کے پسندیدہ کھانے بھی دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں۔

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ جس طرح معدے کا سائز ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس طرح لوگوں کے دل بھی سائز میں ایک جیسے نہیں ہوتے۔ پوسٹ مارٹم کی جانے والی لاشوں سے جو حقائق سامنے آئے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ کسی بھی شخص کا دل اندرونی ساخت کے اعتبار سے دوسرے سے نہیں ملتا۔ جو رگیں دل کو خون فراہم کرتی ہیں ان میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ انسان کے اندرونی جسمانی نظام کی ساخت ایسی ہے کہ آپ جتنی گہرائی میں جائیں گے۔ آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ ہم ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہیں اور ہمارے اعضاء کی ساخت کتنی جدا جدا ہے۔ ویسے تو یہ اختلاف ہر چیز میں دکھائی دیتا ہے لیکن ایسے غدود میں بہت نمایاں فرق نظر آتا ہے جو ہارمونز کو خون میں شامل کرتے رہتے ہیں۔ ان کی کارکردگی میں اختلاف ہماری جسمانی صحت ہماری بھوک پیاس ہمارے جنسی جذبات اور نفسیاتی صحت پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔

انسان کا اعصابی نظام بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر انسانی جلد پر ایسے چھوٹے چھوٹے بے شمار حصے ہوتے ہیں جن میں سے بعض سردی کے لیے زود حس ہوتے ہیں۔ تو بعض گرمی کا اثر جلد قبول کرتے ہیں۔

بعض حصے درد کے لیے زود حس ہوتے ہیں۔ ماہرین نے اس ضمن میں جو تجربات کیے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حصے جہاں ریشوں کا اختتام ہوتا ہے۔ تعداد کے

اعتبار سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ ہر انسانی جسم پر ان کی تعداد جدا جدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹروں نے اپنے نظریات کو پرکھنے کے لیے اکیس صحت مند افراد کے ہاتھوں کا معائنہ کیا۔ ہاتھ کے ایک حصے پر مربع کی صورت میں نشانات لگا دیے گئے اور پھر دیکھا گیا کہ ہر ہاتھ درد کو برداشت کرنے کی کتنی صلاحیت رکھتا ہے۔ ان تجربات سے معلوم ہوا کہ ہر ہاتھ دوسرے شخص سے مختلف تھا۔ مثلاً ایک مربع انچ میں کل ۶۹ مقامات تھے تو بعض ہاتھ ایسے تھے جن میں سے پچیس جگہوں پر درد کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا اور ایک ہاتھ ایسا تھا جس میں اس قسم کا صرف ایک مقام تھا۔ اس قسم کے جائزے ہاتھ کے ایسے حصوں کے بھی لئے گئے جو سردی یا حرارت کے لیے زود حس ہوتے ہیں۔ ان میں بھی کافی فرق موجود تھا۔ اس قسم کا فرق ان خاص مقامات پر بھی پایا جاتا ہے جو آنکھ کان اور ناک میں موجود ہے اور چونکہ یہ مقامات بیرونی دنیا سے معلومات کا واحد سرچشمہ ہیں اس لیے اس کا واحد مطلب ہے کہ ہم میں سے ہر شخص باہر کی دنیا کو مختلف انداز سے دیکھتا ہے۔

جہاں تک دماغ کا تعلق ہے اس کے بارے میں دنیا کے مشہور نیورولوجسٹ ڈاکٹر کارل کا کہنا ہے کہ انسانی دماغ کو کسی بھی پہلو سے لے لیجیے۔ یہ دوسرے شخص سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح انسان کی شکل وصورت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے دماغ اس سے کہیں زیادہ مختلف ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کی سوچ اور فکر دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔

اور یہ بات تقریباً تمام والدین جانتے ہیں کہ ان کے بچے ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہوتے ہیں۔ امریکہ میں اس ضمن میں ۱۲۸ چھوٹے بچوں کا جائزہ لیا گیا۔ انہیں چار ہفتوں سے بتیس ہفتوں تک نگرانی میں رکھا گیا۔ جائزے سے معلوم ہوا کہ بعض بچے بزدل تھے، بعض کا ردعمل بہت سست تھا۔ اسی طرح خوراک، سونے کی عادات اور دوسری چیزوں میں بھی واضح فرق موجود تھا اور شروع ہی سے یہ بات ظاہر ہو رہی تھی کہ ان کی شخصیت ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔

انسانی شخصیت میں پائے جانے والے اس فرق کی بنیاد پر ماہرین اس رائے کا

اظہار کر رہے ہیں کہ آپس میں بہتر تعلقات کے لیے ایک دوسرے کی خوبیوں اور خامیوں اور طبقوں میں تضاد کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ بالخصوص میاں بیوی کے لیے یہ بات بہت ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کو سمجھیں۔ اس طرح گھریلو ناچاقیوں کے خدشات کم ہو جاتے ہیں۔ یورپی ملکوں میں مزاجوں کے درمیان یہ اختلافات عام طور پر ازدواجی زندگیوں میں زہر گھول دیتے ہیں اور بعض اوقات صرف اس وجہ سے کہ کمرے کا درجہ حرارت مزاج کے مطابق نہیں کافی زیادہ گرم ہے یا بہت ٹھنڈی ہے۔ کوئی شخص وقت کا بہت زیادہ پابند ہے اور کوئی پروا نہیں کرتا، اس طرح پسند ناپسند میں فرق ہوتا ہے۔ بعض افراد کی یادداشت تیز ہوتی ہے اور بعض لوگ دوسروں کا کام نام تک بھول جاتے ہیں۔ یہ سب تضادات اور مزاجوں میں فرق باہمی تعلقات کو زہر آلود کر سکتا ہے لیکن اگر انسان ایک دوسرے کو سمجھتا ہے تو پھر ایسی تلخیوں پر قابو پانا نہایت آسان ہو جاتا ہے۔

معجزے رونما کریں

انسان کی بے بسی اور محرومی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اسی نے فطرت کے ان گنت ستم سہے، ہزاروں سال جنگلی جڑی بوٹیاں اور گرے ہوئے پھل کھائے اور اندھیرے غاروں میں چھپ کر زندگی بسر کی۔ مظاہر فطرت وحشی درندوں اور بھیانک عفریتوں کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی وہ کمزور تھا لیکن زندہ رہا کہ اس کے اندر زندگی بسر کرنے کی شمع روشن تھی۔ زندگی کی آرزو نے اسے عزم اور ارادے جیسے غیر مرئی ہتھیار سے مسلح کر دیا۔ ان ہتھیاروں نے اسے ناقابل تسخیر بنا دیا لیکن اسی مقام سے ایک نئے المیے کا آغاز ہوتا ہے۔ انسان ناقابل تسخیر تو ہو گیا لیکن وہ نئی نئی قوتوں کا مفتوح بن کر رہ گیا۔ تحفظ اور ترقی کے لیے اس نے جو دیوزاد مشینیں اور کمپیوٹر

بنائے انہوں نے اسے اپنا ایک معمولی پرزہ بنالیا۔ تنہائی نے اسے آ گھیرا۔ انفرادی زندگی میں کامیاب اور بامعنی کردار ادا کرنے کے امکانات ختم ہوتے چلے گئے۔ بیگانگی اس کا مقدر ٹھہری اور مایوسیوں نے دل و دماغ میں بسیرا کرلیا۔

ماہرین نفسیات نے طویل تجربات اور تحقیق کے بعد انسان کے اندر اس عزم اور ارادے کو پیدا کرنے کا راز پا لیا ہے جو اسے انفرادی سطح پر بھی ان گنت کامیابیوں کے رونما کرنے کی قوت عطا کرتا ہے۔ شرط صرف اتنی سی ہے کہ ماہرین کے بتائے ہوئے اصولوں پر استقامت سے عمل کیا جائے۔

یہ مضمون ماہرین کے طویل تجربے اور تحقیق کا عطر ہے جسے ہم اپنے ایسے تمام قارئین کی نذر کر رہے ہیں جو اپنی زندگی میں کامیابیوں کے معجزے رونما کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔

دانتوں کے ایک مشہور سرجن کے کلینک میں ایک مریض کرسی پر دراز ہے تمام تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ مریض کے مسوڑے ناکارہ ہو چکے ہیں اور کم از کم نو دانتوں کو ہر حال میں نکالا جانا ہے۔ سرجن انجکشن لگاتا ہے اور اپنے کام کا آغاز کر دیتا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد مریض کی آواز ابھرتی ہے۔

''ڈاکٹر صاحب اب دانتوں کو نکالنا شروع کر دیں۔ ڈاکٹر حیرانی سے اس کی طرف دیکھتا ہے۔ نو میں سے چھ نکالے جا چکے ہیں اب صرف تین دانتوں کو نکالا جانا باقی ہے۔ تم کہاں غائب تھے۔ بڑی حیرت ہے تمہیں احساس بھی نہیں ہوا۔'' ڈاکٹر نے حیرت سے پوچھا۔

''اوہ، واقعی...... مریض نے کہا! دراصل میں ایک بہت اہم مسئلے میں الجھا ہوا تھا۔ مجھے خیال بھی نہیں آیا کہ میرے دانت نکالے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے استعجابیہ انداز میں اپنے سر کو ہلایا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

یہ ایک واقعہ ہے۔ ایک ایسا واقعہ جو بالکل منفرد بھی نہیں ہے۔ ایسے واقعات روزمرہ زندگی میں پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن مذکورہ یا ایسے ہی دیگر عام نوعیت کے

واقعات غور و فکر کے ایسے امکانات کی نشان دہی کرتے ہیں جن پر اگر سنجیدگی سے توجہ دی جائے تو انسان کی زندگی کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے اور بلاشبہ اپنی دانست میں درست ہی سوچ رہے ہوں گے کہ آخر اس واقعے میں ایسی کون سی غیر معمولی بات ہے، جس پر سنجیدگی سے غور و فکر کیا جائے۔ آپ کا یہ سوچنا درست سہی لیکن ایک بات ضرور ذہن میں رکھیں کہ دنیا کے حیرت انگیز انکشافات کے پیچھے ہمیشہ معمولی نوعیت کے واقعات ہی کار فرما رہے ہیں۔ چلیے ہم آپ کو ایک مثال دیتے ہیں۔

ایک شخص کی عمر تحقیق اور جستجو میں گزر گئی۔ سالہا سال سے اسے ایک قانون کو دریافت کرنے کی دھن سوار تھی۔ ہر تجربہ ناکام ہو رہا تھا۔ وہ اپنے ذہن کی تمام قوتوں کو بروئے کار لا چکا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اب کیا کرے۔ اسے یوں لگتا تھا کہ جیسے عمر بھر کی محنت رائیگاں چلی جائے گی۔ ذہن میں نا امیدی ہے وہ بے قراری کے عالم میں گھر سے نکلتا ہے اور ایک باغ کی طرف جا نکلتا ہے۔ باغ کے پر فضا ماحول میں اس کا ذہن ہلکا ہو جاتا ہے۔ اور وہ چند لمحوں کے لیے ذہنی دباؤ کے عالم سے باہر نکل آتا ہے۔ اب وہ ایک عام آدمی کی طرح فطرت کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونا شروع ہوتا ہے۔ چہل قدمی کرتا ہوا وہ ایک پیڑ کے نیچے چند لمحوں کے لیے رک جاتا ہے۔ کسی ارادے سے نہیں بلکہ یونہی بلا کچھ سوچے سمجھے۔ یہ درخت سیب کا ہے اچانک ایک ایسا عام واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے جو اس سے پہلے بھی ہزاروں لاکھوں مرتبہ ہوتا چلا آیا ہے۔ ایک سیب پیڑ سے گرتا ہے اور زمین کی طرف آتا ہے۔ پیڑ کے نیچے موجود شخص کی نظریں اس عام واقعہ کا مشاہدہ کرتی ہیں۔ جوں ہی وہ سیب زمین پر ہپ سے گرتا ہے ایک مسرت انگیز چیخ فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہے۔ یوں لگا جیسے پھر کوئی ارشمیدس چیخ اٹھا۔

"پالیا، پالیا، میں نے پالیا!"

ایک عام واقعہ کے ردعمل میں بلند ہونے والے ان چند لفظوں نے انسان کی زندگی بدل کر رکھ دی۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے یہ چیخ کس عظیم سائنسدان کی ہے یا تھی۔ جی ہاں! آپ ٹھیک سمجھے۔ یہ آئزک نیوٹن تھا جس نے ایک عام سے واقعے کا

مشاہدہ کر کے اعلان کیا کہ میں نے قانون ثقل کو پالیا ہے۔ وہی قانون ثقل جس کے باعث آج ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کی اس عظیم صدی میں زندہ ہیں اور اس کے فیوض و برکات سے لطف اٹھا رہے ہیں۔

اب تو آپ کو یقین آ گیا ہوگا کہ زندگی کے عام واقعات بھی اپنے اندر وہ رمز رکھتے ہیں جنہیں اگر انسان دریافت کرلے تو وہ اپنی زندگی میں معجزوں کو رونما کر سکتا ہے۔ موجودہ دور میں انسان گوناگوں مسائل سے دوچار ہے۔ وہ مشینوں کی دنیا میں خود کو ایک پرزے سے زیادہ اہم نہیں سمجھتا اور واقعی حقیقت بھی یہی ہے صنعتی دور نے جس نفسا نفسی کو جنم دیا ہے اس نے انسان کو خوفزدہ کر رکھا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنے دکھ درد اور مسائل میں کس کو شریک کرے۔ کسی کے پاس بھی دوسرے کے لیے وقت نہیں ہے۔ ہر شخص زندگی کا ایندھن بنا ہوا ہے۔ جو خود جل رہا ہے وہ کسی دوسرے کو جلنے سے کیسے بچا سکتا ہے لیکن ان تمام افسردہ کر دینے والی حقیقتوں کے اندر بھی ایک حقیقت پوشیدہ ہے۔ جو اس کو جان گیا اسے یوں سمجھیں نروان حاصل ہو گیا۔ جس پوشیدہ حقیقت کا ذکر ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ ہر تخریب کے اندر ایک صورت تعمیر کی بھی ہوتی ہے۔ ہر غم کے اندر چھپا ہوا ایک امکان اس غم کو دور کرنے کا بھی ہوتا ہے۔ مایوسی کے بطن میں امید پلتی ہے اور ہر خزاں کے بعد بہار بھی آتی ہے اگر سدا سکھ نہیں رہتے تو دکھ بھی ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتے۔ یہی وہ رمز ہے یہی حقیقت ہے جسے اگر سمجھ لیا جائے تو زندگی کی بڑی سے بڑی کامیابی سے لڑی جا سکتی ہے اور سخت سے سخت امتحان سے سرخرو ہو کر گزرا جا سکتا ہے۔

حقیقت سمجھی کیسے جائے

یہ وہ سوال ہے جس کا ذہنوں میں پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ ابتدا میں ہم نے ایک مریض کی مثال دی تھی جسے یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اس کے دانت نکالے جا چکے ہیں۔ پھر آگے چل کر عام واقعات کی افادیت کا ذکر ہوا تھا جس میں اس سیب کے درخت سے گرنے کا ذکر تھا جس نے نیوٹن کو قانون ثقل دریافت کرنے کی راہ سمجھائی تھی

عام واقعات سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ ہمیں اس بنیادی سوال تک لے گیا کہ آخر وہ کونسی حقیقت ہے جسے اگر انسان سمجھ لے تو وہ اپنی زندگی بے مثال کامرانیوں سے ہم کنار کر سکتا ہے۔ امید اور رجائیت جس کا ذکر اوپر ہم نے کیا ہے ایک داخلی اور موضوعی حقیقت ہے۔ خزاں کے بعد بہار، دکھ اور سکھ اور تخریب و تعمیر کا عمل یہ انسانی تاریخ اور تجربے کے عام واقعات ہیں جن سے انسان ہزاروں برسوں سے گزرتا چلا آرہا ہے۔ ان لفظوں اور جملوں کو سن سن کر وہ بیزار ہو گیا ہے۔ اب ہر انسان اس حقیقت کو جاننا چاہتا ہے کہ وہ نامساعد اور مشکل حالات پر کیسے قابو پائے اور اپنی مختصر زندگی کو کامیاب کیونکر بنائے۔

تہوں میں بند گرہ ذات ہے اس کی
بہت الجھی ہوئی نفسیات ہے اس کی

ذات کی گرہ کو کھولنا

کامیابیوں اور کامرانیوں کے معجزے رونما کرنے کی قوت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کی ذات جن تہوں میں بند ہے اور جو گرہیں اس میں لگ چکی ہیں

انہیں کھولا جائے۔انسان کی الجھی ہوئی نفسیات کو سلجھایا جائے اسے آسان بنایا جائے۔جب تک ایسا نہیں کیا جائے گا۔اس وقت تک کسی کے لیے یہ ممکن نہیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ نتیجہ عملی لحاظ سے بہت مایوس کن رہا ہے۔نفسیات دان اس کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب تک انسان خود پر اعتماد بحال نہیں کر لیتا وہ کسی بھی ہدایت یا مشورے پر عمل نہیں کر سکتا یا اگر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔تو ناکامی سے دوچار ہو جاتا ہے۔آیئے ہم عام زندگی میں ہونے والے واقعات میں ایک ایسا واقعہ سناتے ہیں جس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ خود اعتمادی کتنے اہم نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

اب جو کچھ آپ کو سنانے جا رہے ہیں،کوئی افسانہ نہیں بلکہ سچا واقعہ ہے۔یہ واقعہ اس متوقع باپ کا ہے جو آپریشن تھیٹر کے لیے باہر بڑی بے چینی کے عالم میں ٹہل رہا ہے۔وہ یہ جاننے کا منتظر ہے کہ نومولود لڑکا ہے یا لڑکی آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلتا ہے۔دو نرسیں باہر نکلتی ہیں اور اس کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے آگے بڑھ جاتی ہیں۔چند ہی لمحوں بعد ڈاکٹر نمودار ہوتا ہے۔وہ ایک لمحے کے لیے توقف کرتا ہے۔پھر بے چین اور پریشان باپ کو اندر آنے کا اشارہ کر دیتا ہے۔

"قبل اس کے کہ تم اندر جاؤ میں تمہیں ایک ضروری بات بتا دینا چاہتا ہوں۔" ڈاکٹر تیزی سے کہتا ہے!تم خود کو ایک صدمے کے لیے تیار کر لو۔تم ایک لڑکے کے باپ بن گئے ہو لیکن افسوس کہ تمہارے بیٹے کے کان نہیں ہیں کان کی جگہ سپاٹ ہے۔کوئی نشان تک نہیں ہے۔وہ تمام زندگی بہرا رہے گا اور اس میں قوت سماعت کبھی پیدا نہیں ہو سکے گی۔

"وہ بغیر کانوں کے پیدا ہو سکتا ہے ڈاکٹر لیکن وہ تمام زندگی بہرا نہیں رہے گا"

باپ پر اعتماد لہجے میں جواب دیتا ہے۔

"اپنے آپ پر قابو رکھو،جذباتی نہ بنو۔" ڈاکٹر اسے سمجھاتا ہے۔خود کو اس صورت حال کو قبول کرنے کے لیے تیار کرو کہ تمہارا بیٹا تمام زندگی سن نہیں سکے گا۔خواہشیں حقیقتوں کو بدل نہیں سکتیں۔طبی سائنس کے سامنے ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں۔تمہارے بیٹے کی طرح ماضی میں بھی کئی بچے پیدا ہوئے لیکن وہ زندگی بھر سماعت

کی قوت حاصل نہیں کر سکے۔

''ڈاکٹر صاحب۔'' باپ نے جواب دیا۔''میں آپ کے علم اور صلاحیتوں کا اعتراف کرتا ہوں لیکن میں بھی ایک اعتبار سے ڈاکٹر ہوں۔''

''وہ کیسے؟'' ڈاکٹر نے حیرت سے پوچھا۔

''میں نے ایک ایسا طاقتور علاج دریافت کر لیا ہے جو ہر صورتحال میں کارگر ثابت ہوتا ہے۔ اس علاج کا پہلا قدم یہ ہے کہ جب انسان کسی ناپسندیدہ صورتحال کی ناگزیریت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔''

''تو پھر اب آپ کیا کریں گے؟'' ڈاکٹر نے دوبارہ سوال کیا۔

''میں ابھی اور اسی وقت آپ کے سامنے یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں اپنے بیٹے کے اس پیدائشی نقص کو تصور نہیں کرتا جسے درست اور ٹھیک نہ کیا جا سکتا ہو۔'' باپ نے انتہائی پراعتماد انداز میں ڈاکٹر کو جواب دیا۔

ڈاکٹر نے کسی فوری ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ حیرت سے اس شخص کو دیکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو۔''تم ایک بدنصیب باپ ہو۔ مجھے تم پر رحم آ رہا ہے۔ زندگی میں بعض معاملات ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں نہ چاہتے ہوئے بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔'' ڈاکٹر نے خاموشی سے اس کا بازو تھاما اور آپریشن تھیٹر کے اندر لے گیا جہاں نومولود بچہ اور بیوی اس کی منتظر تھی۔

وقت کسی کا پابند نہیں کسی کو اختیار نہیں کہ اسے گزرنے سے روک سکے۔ اس واقعہ کو پچیس سال بیت گئے۔ ٹھیک پچیس سال بعد لیبارٹری سے ایک دوسرا ڈاکٹر مسکراتا ہوا باہر نکلا۔ اس کے ہاتھوں میں چند ایکسرے تھے۔''معجزہ ہو گیا'' اس پر حیرت کا عالم طاری تھا!'' میں نے اس نوجوان کے سر کا ہر زاویے سے ایکسرے لیا ہے۔ مجھے کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا کہ جس کی بنیاد پر میں یہ کہہ سکوں کہ یہ نوجوان قوت سماعت رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی سماعت کی صلاحیت پینسٹھ فیصد بحال ہو چکی ہے۔''

یہ ڈاکٹر امریکہ کے شہر نیویارک سٹی کے مشہور ہسپتال کا ایک نامور کانوں کے

امراض کا ماہر تھا۔ اس کے ہاتھوں میں جس نوجوان کے ایکسرے تھے یہ وہی نوجوان تھا جسے پچیس برس پہلے طبی لحاظ سے لاعلاج قرار دیا جا چکا تھا اور جس کی قوت سماعت صرف اس وجہ سے بحال ہو سکی تھی کہ اس کے باپ نے انتہائی عزم اور اعتماد کے ساتھ اس مایوس کن صورتحال کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس باپ نے مسلسل برسوں تک اپنے اعتماد کی قوت کو کام میں لا کر اپنے لڑکے کی قوت سماعت کو پینسٹھ فیصد کی حد تک بحال کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اس لڑکے نے کالج کی حد تک تعلیم حاصل کی اور اس کی کارکردگی بہترین طلباء سے کسی بھی طور پر کم نہیں تھی۔ وہ عام اور روزمرہ کی زندگی میں بحال ہو گیا تھا اور اسے کسی محرومی کا احساس نہیں تھا۔

یہ ایک معجزہ تھا لیکن یہ "معجزہ" رونما کیسے ہوا؟

اس لڑکے کے سر کے اندر کیا تبدیلیاں ہوئیں کہ وہ سننے کی صلاحیت سے مالا مال ہو گیا؟ اگر ایسی کوئی تبدیلیاں رونما ہوئیں تو ایکسرے میں ان کا سراغ کیوں نہیں ملا؟

یہ اور اس جیسے کئی سوالات کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ جب کانوں کے ایک ماہر سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بچے کے باپ نے اس کے لاشعور کے ذریعے ذہن کو مسلسل ہدایات دیں جس کے نتیجے میں ذہن نے اعصابی نظام کی صلاحیت کو بڑھا کر دماغ کا رابطہ کاسۂ سر کے ساتھ جوڑ دیا۔ اور بچے کے اندر سننے کی صلاحیت بحال ہو گئی اس صلاحیت کو اب ہڈی کا مواصلاتی نظام بھی کہا جاتا ہے۔"

خود اعتمادی کے بعد دوسری سب سے اہم نفسیاتی تیاری کا تعلق ذہنی رویوں سے ہے۔ انسان عام طور پر غیر واضح ذہنی رویوں میں مبتلا رہتا ہے۔ ذہن کی اس صورتحال کی موجودگی میں اس کے لیے ممکن نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی شخصیت کو ان اصولوں کے تابع کر سکے جن کا ذکر ہم کرنے والے ہیں اور جو زندگی میں معجزے پیدا کر دینے کی صلاحیتوں کو بیدار کر دیتے ہیں۔

مثبت ذہنی رویہ

اگر آپ اپنے ذہنی رویوں پر کنٹرول حاصل کر لیتے ہیں آپ ایسی ہر صورتحال کا کامیابی سے مقابلہ کر سکتے ہیں جو آپ کی زندگی پر کسی بھی طور پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔

ذہنی رویہ بہت اہم ہے

سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم تجزیہ کر کے خود کو قائل کر لیں کہ ذہنی رویے ہماری زندگی میں کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

یہ آپ کا ذہنی رویہ ہے جو لوگوں کو آپ کا دوست یا دشمن بناتا ہے۔ اب اس کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ آپ کا رویہ کتنا مثبت یا منفی ہے۔ اس کا فیصلہ ہمیں نہیں بلکہ خود آپ کو کرنا ہوگا۔

ایک صحت مند جسم کے لیے بھی ذہنی رویہ ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ تمام ڈاکٹر جانتے ہیں اور زیادہ تر اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ دواؤں کے علاوہ جو عنصر مریض کی جلد صحت یابی میں سب سے زیادہ فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے وہ اس کا ذہنی رویہ ہوتا ہے۔

عبادات میں ذہنی رویہ اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ اگر کوئی منفی رویوں یعنی خوف، جھجک، بے یقینی اور تذبذب و انتشار کے عالم میں عبادت کرے گا تو اس کے ایمان اور یقین میں وہ قوت اور جذبہ پیدا نہیں ہو سکے گا جس کے ذریعے انسان کی عبادات بار آور ثابت ہوتی ہیں۔

غیر متوازن ذہنی رویوں کے باعث انسان حادثات کا شکار ہو جاتا ہے۔ ٹریفک کے حادثات کا سروے یہ ثابت کرتا ہے کہ گاڑی چلانے والا نارمل ذہنی حالت میں نہیں تھا۔ اس کا ذہن یا تو شراب کے زیر اثر تھا، یا وہ غیظ و غضب کے عالم میں تھا یا

ذہنی طور پر بہت زیادہ منتشر تھا۔

اپنے ذہنی رویے کے سبب ہی انسان سماج میں عزت اور مقام حاصل کرتا ہے، کامیابیاں حاصل کرتا ہے۔ دوست بناتا ہے، کاروباری روابط پیدا کرتا ہے اور لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا کر مدد پر آمادہ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ انسان کا ذہنی رویہ ہی سب کچھ ہے تو یہ بات زیادہ مبالغہ آمیز محسوس نہیں ہوگی۔

انسان کے ذہنی رویے کی اہمیت کا اس سے بڑا کوئی دوسرا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ یہ پہلی اور آخری چیز ہے جس پر ہر فرد کا بلا شرکت غیرے مکمل اختیار ہوتا ہے۔ ہم دوسروں کے خیالات اور عمل پر کسی قسم کا اختیار یا تسلط نہیں رکھتے۔ موت اور زندگی ہمارے قبضۂ قدرت سے باہر ہے۔ ہاں ایک چیز پر ہمارا کلی اختیار ہے اور وہ چیز ہے ''خیال'' یعنی جو کچھ ہمارا ذہن سوچتا ہے۔ یہ اختیار اس وقت سے ہمیں حاصل ہو جاتا ہے جب ہم سوچنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور پھر سوچنے اور اس کے اظہار کرنے کا استحقاق ہمیں مرتے دم تک حاصل رہتا ہے۔

انسان کا خیال جو اس کے ذہنی رویے کو جنم دیتا ہے۔ بلاشبہ ایک بڑی ٹھوس اور گہری صداقت ہے۔ خالق کائنات نے انسان کو پیدا کیا اور اسے دنیا کی سب سے بڑی دولت یعنی سوچنے کی صلاحیت عطا کر دی۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اس عظیم قوت سے کتنا استفادہ کرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو کن رویوں کے تابع کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں کتنی کامیابیاں یا ناکامیاں حاصل کرتا ہے۔

قدرت کے بے بہا عطیے نے انسان کو یہ جرأت دی کہ وہ کہہ سکے کہ میں اپنی تقدیر کا مالک ہوں اور میں خود اپنا ناخدا ہوں۔ بلاشبہ انسان اس دنیا میں اپنی قسمت خود بنا سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ اپنی قسمت بنانے پر کس حد تک قادر ہو سکتا ہے؟ اس کا سیدھا سادھا جواب یہ ہے کہ جتنا انسان اپنے ذہن کو کام میں لائے گا اور اپنے ذہنی رویوں پر اختیار حاصل کرے گا اتنا ہی زیادہ کامیاب ہو سکے گا۔

☆☆............☆☆............☆☆

ڈیل کارنیگی کی خوبصورت زندگی بنانے اور کامیابی حاصل کرنے کی بہترین کتابیں

ذہنی دباؤ سے نجات

پریشان ہونا چھوڑیئے

خود اعتمادی بڑھایئے

ازدواجی تعلقات

قوتِ ارادی کا جادو

ترقی کے 15 اصول

دوسروں پر جادو کیجئے

گفتگو کا فن

دولت و شہرت کا زینہ

زندگی گزارنے کے سنہرے اصول

ناکامی سے بچنے کا فن

کامیابی کا راز

شمع بک ایجنسی نوید اسکوائر اردو بازار کراچی